وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ

اور ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا تو کوئی ہے نصیحت قبول کرنے والا

(القمر: ١٧)

موضوعاتی

درسِ قرآن

آیۃ الکرسی مع آیاتِ ملحقہ

افادات

از

مفکرِ اسلام فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی شاہ محمد نوال الرحمٰن صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

شریعہ بورڈ آف انڈیا

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ

اور ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا تو کوئی ہے نصیحت قبول کرنے والا۔

(القمر: ۱۷)

موضوعاتی

درسِ قرآن

آیۃ الکرسی مع مُلحقہ آیات

افادات

از

مفکرِ اسلام فقیہ العصر حضرت مولانا شاہ مفتی محمد نوال الرحمن صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

باہتمام: شریعہ بورڈ آف انڈیا

تفصیلاتِ کتاب

جملہ حقوقِ طباعت بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	:	موضوعاتی درسِ قرآن
ازافادات	:	مفکرِ اسلام فقیہ العصر حضرت مولانا شاہ مفتی محمد نوال الرحمن صاحب مفتاحی دامت برکاتہم
زیرِ سرپرستی	:	پیرِ طریقت رہبر شریعت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ محمد جمال الرحمن صاحب مفتاحی دامت برکاتہم
زیرِ اہتمام	:	شریعہ بورڈ آف انڈیا تحت رحمتِ عالم فاؤنڈیشن (شکاگو، امریکہ)
تصحیح و تخریج	:	مفتی محمد رضاء الرحمٰن عابد قاسمی، مفتی محمد عطاء الرحمٰن ساجد قاسمی
تعداد	:	۱۰۰۰
صفحات	:	۱۸۴
سن طباعت	:	اپریل ۲۰۱۳ء مطابق جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ
قیمت	:	۱۵۰

ملنے کے پتے

آستانۂ صوفی یوسف نگر ٹپہ چبوترہ حیدرآباد، فون نمبر: 9703679565

شریعہ بورڈ آف انڈیا، موتی گلی خلوت گراؤنڈ حیدرآباد، 24512525-040

ہندوستان پیپر ایمپوریم، مچھلی کمان حیدرآباد

دکّن ٹریڈرس، چارمینار، حیدرآباد

Rahmat-e-Alam Foundation
7045 N Western Avenue, Chicago, IL 60645
Phone No: (773) 764-8274

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

صفحہ نمبر	عناوین
۹	مختصر تعارفی کلمات
۱۱	احوالِ واقعی
۱۷	آیۃ الکرسی کے حفظ و تلاوت کا اہتمام
۱۸	"آیۃ الکرسی" کے فضائل
۱۹	قرآن پاک کی سب سے عظیم آیت
۲۱	"آیۃ الکرسی" اور اجازتِ نکاح
۲۲	اسقاطِ مہر بندے کا حق نہیں
۲۳	تحیۃ المسجد کی شرعی حیثیت
۲۵	صدقہ کی طاقت
۲۶	"آیۃ الکرسی" جان ومال کی حفاظت کا باعث
۲۸	فرشتوں کے ذریعے انسان کی حفاظت
۲۹	حضور ﷺ کی حفاظت آیۃ الکرسی سے
۳۱	"آیۃ الکرسی" جنت میں دخولِ اولی کا باعث
۳۲	آیۃ الکرسی کی اتنی فضیلت کیوں؟
۳۲	علم توحید عظمت وبلندی کا ذریعہ
۳۳	مضامینِ آیۃ الکرسی کا اجمالی تذکرہ

صفحہ نمبر	عناوین
۳۴	تخلیقِ انسان کا مقصد
۳۵	لائقِ عبادت ذات
۳۵	باری تعالیٰ کی صفتِ قیومیت
۳۸	اسمِ اعظم کی خصوصیت
۳۹	عظمتِ باری کا فرشتوں پر اثر
۴۰	انسان اور اس کی عبادت کی حقیقت
۴۲	اللہ کی بڑائی نبی اور فرشتوں کی زبانی
۴۳	مخلوقات کا وجود بطورِ تجددِ امثال
۴۴	اللہ تعالیٰ اونگھ اور نیند سے پاک ہیں
۴۷	نیند موت ہی کی ایک کیفیت
۴۹	آسمان وزمین کی تمام چیزوں کا مالک
۴۹	حق تعالیٰ اور نظام سفارش
۵۰	شفاعت کا مقصد
۵۲	نصوص میں رائے زنی عظمتِ باری سے ناواقفیت کا نتیجہ
۵۳	جلالِ خداوندی
۵۴	انبیاءِ کرام پر جلالِ خداوندی کا اثر
۵۵	"ساعۃ" کا بھاری پن
۵۶	اہلِ جنت کی صفیں
۵۷	اُمتِ محمدیہ کی خصوصیت

عناوین	صفحہ نمبر
باری تعالیٰ کا علمِ محیط	۵۸
خالق و مخلوق کے علم میں کوئی جوڑ نہیں	۵۹
حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے علم اور دیگر مخلوقات کے علم میں کوئی تناسب نہیں	۵۹
کنہِ باری عقلِ انسانی سے بالاتر	۶۱
اللہ تعالیٰ کی طرف کرسی کی نسبت	۶۴
کرسی کی وسعت	۶۵
انسان مخلوق کی حقیقت سے بے بہرہ	۶۶
حاملانِ عرش و کرسی	۶۸
افلاک میں اللہ کی قدرت	۷۰
قدیم صرف اللہ تعالیٰ کی صفتِ خاصہ	۷۲
اسلام اور علمِ سائنس کا موازانہ	۷۲
حاملانِ عرش کی تسبیحات	۷۳
حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت کا قصہ	۷۵
روح کی لطافت	۷۸
"کشفِ شرعی" اور "کشفِ کونی"	۷۸
کشف کی عقلی دلیل	۷۹
"کرامت" اور استدراج	۷۹
ایک بزرگ کی کرامت	۸۰
لطافتِ نفسِ ناطقہ کے نتائج	۸۱

صفحہ نمبر	عناوین
۸۲	اسماءِ باری تعالیٰ کی تجلیات
۸۳	نظامِ کائنات کا مقصد
۸۴	کرسی باری تعالیٰ کا محلِّ جلوس نہیں
۸۴	کرسی سے کیا مراد ہے؟
۸۵	ایک اعتراض اور اس کا جواب
۸۸	جسم اطہر سے مس شدہ حصۂ زمین کی فضیلت
۹۱	دین میں جبر نہیں
۹۲	انسان اور جنات ہی مختار ہیں
۹۲	اطاعت اور عبدیت میں فرق
۹۳	انجام میں کسی کو اختیار نہیں
۹۴	"لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ" کا شانِ نزول
۹۶	جبر کا محل
۹۶	اسلام میں جبر نہ ہونے کی وجہ
۹۷	جیب کترے کا واقعہ
۹۸	غیر مسلموں کا اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ
۱۰۰	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا رسانی
۱۰۲	تعذیبِ مسلمین صحابہ سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر گراں
۱۰۳	حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر ظلم
۱۰۴	حضرت عمار رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ پر ظلم

عناوین	صفحہ نمبر
اسلام اور ایمان کا محل	۱۰۵
اصل دعوت یا جہاد؟	۱۰۶
اسلامی تاریخ میں مقتولین کی تعداد	۱۰۶
اقسام جہاد	۱۰۷
نظامِ جزیہ	۱۰۸
جان بچانے کیلئے کلمہ پڑھنے پر بھی امن	۱۰۹
ہدایت اور گمراہی	۱۱۰
طاغوت کیا ہے	۱۱۰
اسلام کی رَسّی ازل سے مضبوط ہے	۱۱۱
طاغوت سے کنارہ کشی کا ثمرہ	۱۱۲
ولایتِ باری تعالیٰ کے ثمرات	۱۱۳
اللہ پاک اہلِ ایمان کے ولی ہیں	۱۱۴
امتِ محمدیہ کے مؤاخذہ کی صورتیں	۱۱۵
ہدایت کی اقسام	۱۱۷
نبی کی طرف ہدایت کی نسبت	۱۱۸
نور کی اقسام	۱۱۹
شیطان کا حربہ	۱۲۱
کمالِ ایمان کے حصول کا طریقہ	۱۲۳
حضرت عمرؓ کا معیار	۱۲۴

عناوین	صفحہ نمبر
حضرت جابرؓ کا قصہ	۱۲۴
جتنی رعایت اتنی دشمنی	۱۲۵
ولایتِ کی اقسام	۱۲۶
مؤمنوں اور غیر مؤمنوں کے ساتھ حق تعالیٰ کا ضابطہ	۱۲۷
صرف ایمان بھی بہت بڑی دولت ہے	۱۲۸
تبلیغ میں جانے کا مقصد	۱۲۹
مسلمان اور کافر میں جوڑ نہیں	۱۳۰
گنہگار مسلمان کا مؤاخذہ کیوں؟	۱۳۱
مسلمانوں پر قتل مسلط ہونے کی وجہ	۱۳۱
پوری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے	۱۳۲
تبلیغِ اسلام مسلمانوں کی ذمہ داری	۱۳۳
ولایتِ عامہ کا فائدہ	۱۳۵
ولایتِ خاصہ	۱۳۶
ولایت کے درجات	۱۳۸
اولیاء اللہ کے لئے بشارت	۱۳۸
موت کے وقت مومن کی شرمندگی	۱۳۹
مومن اور کافر کی روح نکلنے کی کیفیت	۱۳۹
ولی کی فضیلت	۱۴۰
مسئلہ ولایت کو تفصیلاً ذکر کرنے کا سبب	۱۴۱

عناوین	صفحہ نمبر
ایمان و تقویٰ میں کمال حاصل کرنے کا ثمرہ	۱۴۳
وصول اور نسبت مع اللہ	۱۴۳
اللہ تعالیٰ جسم سے سبحان ہیں	۱۴۴
قرب سے مراد	۱۴۵
فناء فی اللہ کی حقیقت	۱۴۶
مجنون اور مجذوب میں فرق	۱۴۷
اہل تعلق کے لیے ذکرِ الٰہی باعثِ انبساط	۱۴۹
ولایت کی بنیاد	۱۵۱
ظاہر و باطن سے متعلق ایک دھوکہ	۱۵۳
اعمالِ ظاہری و باطنی کی دوسری تعبیر	۱۵۵
شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت	۱۵۷
اولیاء اللہ کی اقسام	۱۵۸
حضرت عبد القادر جیلانیؒ کو "غوث" کا لقب ملنے کی وجہ	۱۵۹
قطب التکوین	۱۶۰
اہلِ تکوین کی مثال	۱۶۰
اہلِ تکوین کے افعال کی حقیقت	۱۶۱
ایک وزیر کا واقعہ	۱۶۳
افعالِ باری تعالیٰ حکمت سے خالی نہیں	۱۶۴
ولایت اور بزرگی کا مقصودِ اصلی	۱۶۶

عناوین	صفحہ نمبر
قربِ الٰہی کے حصول کا ذریعہ	۱۶۷
بزرگی کی حقیقت	۱۶۸
مولانا الیاس صاحبؒ بھی قطب الارشاد میں سے ہیں	۱۶۹
تبلیغی تحریک کی ابتداء	۱۷۱
حقیقی محبت کی ایک مثال	۱۷۱
"توکل" بہترین ذریعۂ معاش	۱۷۳
تبلیغی جماعت کے دو بنیادی کام	۱۷۴
صحبت اہل اللہ سے نورانی ماحول قائم ہونے کی مثال	۱۷۴
اہل اللہ کی صحبت کا بدل	۱۷۵
مجاہدہ کے اقسام	۱۷۵
حضور ﷺ کی ایک نظر بھی ولایتِ خاصہ کے لئے کافی ہے	۱۷۷
حضرت شاہ عبد القدوس گنگوہیؒ کے پوتے کا واقعہ	۱۷۹
مجاہدۂ حکمی پر مجاہدۂ حقیقی کا انحصار	۱۸۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مختصر تعارفی کلمات

از

پیرِ طریقت رہبرِ شریعت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ محمد جمال الرحمن صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

برادرم مکرم مفتی محمد نوال الرحمن صاحب زیدت معالیہ بچپن ہی سے نہایت ذہین رہے، کم عمری ہی میں حفظِ قرآن مجید کی تکمیل فرمائی، مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد سے درجۂ فضیلت تک عالمیت کی تعلیم پائی، اور وہیں سے افتاء بھی کیا، دورانِ تعلیم ہمیشہ ہی اپنے ہم عصروں پر فائق رہے، جنوبی ہند کے عظیم بزرگ صاحبِ حال شخصیت اپنے والدِ ماجد صوفی غلام محمد صاحبؒ سے روحانی تعلیم خوب پائی، حضرت مسیح الامتؒ سے اصلاح وتربیت اور فقہِ باطن کی لائن سے بھی خوب استفادہ کیا، حضرت صوفی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت ڈاکٹر تنویر احمد خان صاحبؒ سے اجازتِ بیعت و خلافت سے نوازے گئے، عرصۂ دراز تک جامعہ اسلامیہ دارالعلوم حیدر آباد میں صدر مدرس رہتے ہوئے تفسیر، حدیث اور فقہ کی تدریس میں مشغول رہے اور اب ماشاء اللہ شکاگو امریکہ میں شریعہ بورڈ، دینی مدرسہ اور عصری اسکول میں بحسن وخوبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ماشاء اللہ اللہ تعالیٰ نے فہم وبصیرت، علمی وسعت، تصلب فی الدین اور جذبۂ خدمت سے خوب مالا مال فرمایا۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایک ہی شخص تعلیم وتدریس، تقریر وخطابت میں ممتاز بھی ہو، عمومی دعوت وتبلیغ کا بھی خاص ذوق رکھتا ہو، اصلاح وتربیت کا بھی جسے خصوصی ملکہ ہو، فقہ وفتاویٰ کے کام میں مشغول بھی ہو، دینی وعصری تعلیمی اہم مراکز کا ذمہ دار بھی ہو

نظم و انتظام کا بھی سلیقہ ہو، صلہ رحمی اور ضرورت مندوں کی خدمت و تعاون میں فراخ دل بھی ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مفتی صاحب کے حسنِ تعلم، حسنِ خدمت، حسنِ ادب کے نتیجہ میں اپنے اکابر کے فیوض کی برکت سے ان تمام خوبیوں سے سرفراز فرمایا ہے۔

مولانا موصوف کے بیانات و خطابات بہت مبسوط علوم سے معمور اور مخاطبین کے احوال کے اعتبار سے نہایت موزوں اور مفید ہوتے ہیں۔ جو بڑی مقدار میں آڈیو کیسٹس میں اور انٹرنیٹ پر موجود ہیں، ضرورت تھی کہ ان کو کتابی شکل بھی دیدی جائے تاکہ مستقل طور پر محفوظ بھی رہ سکیں اور افادیت زیادہ سے زیادہ ہو۔

الحمد للہ مولانا کے فرزندان اس طرف متوجہ ہوئے اور موصوف کے دروسِ قرآن، بیانات و فتاویٰ کو قلم بند کرنے کا کام شروع کیا۔

زیرِ نظر مسوّدہ موضوعاتی درس کے اعتبار سے قرآن کریم کی عظیم ترین آیت، آیۃ الکرسی کا بیان فرمودہ مفصل اور مبسوط مواد ہے، جسے کتابی شکل میں پیش کرنے پر صاحبزادگان کو مبارکبادی پیش کرنے کو جی چاہتا ہے، کیا ہی بہتر ہو گا کہ مولانا کے تمام دروس یکے بعد دیگرے شائع ہوتے رہیں، تاکہ بندگانِ حق خوب فائدہ اٹھا سکیں۔ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو قبول فرمائے اور سب کے لئے نافع بنائے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

احوالِ واقعی

الحمدللہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی سید الانبیاء و المرسلین اما بعد:

قرآن مجید اللہ رب العالمین کی جانب سے، سرکار دوعالم رحمۃ للعالمین محمد رّسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والی وہ بابرکت کتاب ہے جو کلام اللہ ہونے کی حیثیت سے انتہائی باعظمت اور قابل صد قدر و منزلت اور متلاشیانِ حق کے لیے سراسر راہِ بصیرت و ہدایت ہے، اعجازِ کلام کے اعتبار سے منتہائے فصاحت و بلاغت اور علوم و فنون کے لحاظ سے مرکزِ جامعیت ہے قبولیت کی استعداد رکھنے والوں اور سادہ لوح لوگوں کے لیے تلقین و نصیحت اور پیامِ بشارت ہے اور غرور و پندار کی ظلمتوں میں بھٹکنے والوں کے لیے اس میں صاف صاف اعلانِ رسوائی و فضیحت ہے، امراضِ روحانی و جسمانی کے لیے باعث شفاء و رحمت اور تمام امورِ زندگی کے لیے سرچشمۂ حکمت و عدالت ہے اس کی تلاوت کا اہتمام کرنے والوں اور اس سے محبت رکھنے والوں کے لیے دنیوی زندگی میں بھی یہ سببِ نور و برکت اور ابدی زندگی میں نجات کے لیے ذریعۂ شفاعت اور واسطۂ دخولِ جنت ہے اس پر عمل کرنے والوں کے لیے عند اللہ قرب و مقبولیت اور آخرت میں بہترین بدلہ اور ہمیشہ ہمیشہ کی نعمت ہے اس کے بالمقابل روگردانی کرنے والوں کے لیے یہ موجبِ حسرت و محرومیت ہے۔

اس سرچشمۂ رُشد و ہدایت کے پیغام کی تعلیم و تبلیغ اور دعوتِ حق کی اشاعت و ترویج اور اصلاحِ مسلمین کی کوششیں روزِ اوّل سے رہبرانِ دین اور علماء شرعِ متین کی جانب سے مختلف انداز میں ہوتی رہی ہیں اور انشاء اللہ ہوتی رہیں گی زیرِ نظر آیۃ الکرسی کے دروسِ قرآن کا مجموعہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو آج سے تقریباً دس برس قبل والد بزرگوار نامور مفتی ممتاز عالمِ دین فقیہ العصر حضرت شاہ محمد نوال الرحمن صاحب مفتاحی دامت برکاتہم نے امریکہ میں دیئے ہیں، حضرت والا کی

ذاتِ گرامی نہ صرف ریاستِ آندھرا پردیش بلکہ جنوبی ہند کی بیشتر ریاستوں اور شمالی ہند کے علمی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں ،اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے شمار کمالات سے نوازا ہے آپ انتہائی ظریف الطبع سادہ مزاج نہایت ذکی و ذہین ، نکتہ آفریں ہونے کے ساتھ علم و عمل اور اخلاص کے پیکر ہیں نیز علمی فضل و کمال کے ساتھ وعظ و تبلیغ میں یکتائے روزگار ہیں، آپ کا آبائی وطن مغل گدہ ضلع محبوب نگر ہے،وہیں حفظ قرآن مجید کی تکمیل حافظ خلیل اللہ صاحب دامت برکاتہم کے یہاں فرمائی بعد ازاں ابتدائی کتابوں کی تعلیم کے بعد مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد،یوپی کارخ کیا جہاں حضرت شاہ مولانا مسیح اللہ خان صاحب نوّراللہ مرقدہ کی زیر تربیت افتاء تک کی تعلیم مکمل فرمائی، تعلیم ظاہری کے ساتھ ساتھ باطنی تعلیم کے لیے حضرت مسیح الامت کی مجالس سے بلاناغہ مستفید ہوتے رہے نصاب تعلیم سے فراغت کے بعد حضرت مسیح الامت کے یہاں چھ ماہ قیام فرما کر بیعت وارشاد کے ذریعہ تزکیہ واحسان کی دولت سے مالامال ہوئے،وہاں سے واپسی کے بعد دکن کی بلند پایہ عظیم شخصیت آپ کے والد ماجد حضرت شاہ صوفیؔ غلام محمد صاحب نوّراللہ مرقدہ وبرد مضجعہ خلیفہ حضرت شاہ محمد حسین صاحب ؒ ناظم ونپرتی نے آپ کو خلافت سے سرفراز فرمایا حضرت صوفی صاحبؒ کے بعد ڈاکٹر تنویر الحق صاحبؒ پاکستان خلیفہ حضرت مسیح الامتؒ (حال ہی میں حضرت کا انتقال ہوا ہے) سے مجاز ہوئے، تحصیل و تکمیل کے بعد مسندِ درس پر فائز ہو کر تشنگان علوم کو سیراب کرنے لگے چنانچہ دارالعلوم سبیل السلام (جو اس وقت مہدی پٹنم ،حیدرآباد میں واقع تھا) کے اولین مدرسین میں سے آپ کا شمار ہوتا ہے پھر دارالعلوم حیدرآباد میں آپ نے تقریباً اٹھارہ سال قرآن و حدیث اور فقہ کی بڑی بڑی کتابوں کا دورۂ حدیث و افتاء میں بڑی مقبولیت کے ساتھ درس دیا ہے، کتاب و حکمت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ نے وعظ وارشاد کے ذریعہ بھی اپنے فرضِ منصبی کو بخوبی انجام دیا، جس سے ہزاروں بندگانِ خدا میں انقلاب و دینی بیداری پیدا ہوئی،بعد ازں آپ نے چند احباب کی درخواست پر امریکہ کا سفر کیا اور اسی وقت سے تاحال شکاگو میں (تقریباً بیس

سال) سے مقیم ہیں اور وہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت والا سے ایسا کام لیا ہے کہ جس کی نظیر ان جیسے ملکوں میں بہت ہی کم دیکھنے میں آتی ہے، حضرت والا نے اولاً رحمتِ عالم فاؤنڈیشن کی بنیاد ڈالی جس کے تحت مسلمان لڑکیوں کو بے دینی اور بے حیائی کے ماحول سے بچانے کے لیے دارالعلوم شکاگو قائم کیا جس میں آپ بخاری شریف اور حدیث کی دیگر بڑی بڑی کتابوں کا درس دیتے ہیں، دینی ماحول وتربیت کے ساتھ چلنے والے دینی وعصری نصاب تعلیم پر مبنی گائیڈنس اسکول کی سرپرستی ونگرانی نے شکاگو میں ایک انقلاب پیدا کردیا اور عوام الناس کی رہبری کیلئے آپ نے شریعہ بورڈ آف امریکہ کا قیام عمل میں لایا جس کے تحت ذبیحہ سپروائزری بورڈ نے اس ماحول میں حلال وحرام کو ممتاز کرکے امت کو حرام سے بچانے میں بڑی کامیابی حاصل کی، مقامی دارالافتاء و دارالقضاء اور ویب سائٹ www.shariahboard.com کے ذریعہ عالمی سطح پر بندگانِ خدا نے پرسنل وذاتی اور عمومی مسائل میں الحمدللہ استفادہ کیا اور کررہے ہیں نیز آپ کے خطباتِ جمعہ، اصلاحی و تبلیغی پروگرامس اور تزکیۂ نفوس کی مجالس سے ہزاروں لوگ بحمد اللہ مستفیض ہورہے ہیں، حضرت والا کے تقاریر و مواعظ، فکری واصلاحی، دعوتی وتبلیغی، تعلیمی اور معاشرتی ہم آہنگی سے لبریز ہوتے ہیں اور منقول کے ساتھ معقولیت آپ کا وصف ممتاز ہے لیکن ایک خصوصیت وامتیاز اللہ رب العزت کی جانب سے حضرت والا کی ذات گرامی میں پایا جاتا ہے کہ آپ تعلیم و تبلیغ اور تزکیہ تینوں ذمہ داریوں کو بحسن خوبی آنجام دیتے ہیں اور تینوں میں ہی اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ کمال اور مقبولیت عطاء فرمائی ہے جس کے بارے میں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہا جاتا کہ "ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ" یہی وجہ ہے کہ قارئین ان دروس میں بھی تینوں قسم کے مضامین سے ہم آہنگی محسوس کریں گے۔

موجودہ زمانے میں دروس قرآن کے بہت سے حلقوں میں عام بے اعتدالی یہ پائی جاتی ہے کہ وہاں قرآن پاک کی صحیح تشریح تو کجا مغربیت سے مرعوب ہونے کے نتیجہ میں اسلاف امت کی تفاسیر سے بیزاری، من گھڑت تاویلات، غلط تشریحات اور رائے زنی کی بھرمار کا گرما گرم ماحول

رہتا ہے تفسیرِ قرآن کے معاملہ میں اس جرأتِ بے جا نے تحریفات کا ایک فتنہ خیز دروازہ کھول دیا ہے اور کلام اللہ دور حاضر کے مغرب زدہ پروفیسرس وڈاکٹرس کا تختۂ مشق بن کر رہ گیا ہے لیکن حضرت والا کے دروس میں اسلافِ امت اور اکابرِ مفسرین کی تشریحات کے ساتھ تصلب فی الدین والمذہب کا نمونہ دکھائی دے گا۔

عرصۂ دراز سے خواص وعوام کے حلقہ میں شدت سے یہ ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ حضرت والا کے جملہ خطابات ضبط تحریر لائے جائیں تاکہ یہ علمی وروحانی سوغات دور دور تک پہنچے اور اس کا فائدہ عام ہو، احقر بھی اس سلسلہ میں فکر مند تھا اور اس اہم کام کے لیے مسلسل سعی وکوشش میں لگا رہا لیکن یہ سعادت ہمارے لیے اس وقت میسر ہوئی جب شریعہ بورڈ آف انڈیا موتی گلی خلوت حیدرآباد میں ہمیں فتاوی کی ذمہ داری کے ساتھ حضرت والا کے دروس وخطبات کی تصحیح و ترتیب وغیرہ کی ذمہ داری بھی نصیبہ میں آئی۔ یوں تو دروسِ قرآن کے حلقوں سے حضرت والا کی تقریباً کئی سورتوں کی تفسیر ہوچکی ہے مگر دروس چونکہ موضوعات ومواقع کی مناسبت سے مختلف سورتوں کے ساتھ دیئے گئے ہیں، اس لیے ترتیب وار اس کام کو انجام نہیں دیا جاسکا، ویسے کئی سورتوں کی تفسیر، تصحیح وترتیب پاچکی ہے جو انشاء اللہ العزیز عنقریب منظر عام پر آئے گی، لیکن سرِدست یہ مجموعہ تیار ہوگیا تو ہم نے بلاکسی تاخیر کے یہ مسوّدہ منظر عام پر لانے کو مناسب سمجھ کر بقیہ مراحل سے گزارا ہے جو آج زیور طبع سے آراستہ ہو کر آپ کے ہاتھ میں موجود ہے۔

اربابِ بصیرت جانتے ہیں کہ عوام الناس کیلئے قرآن کا درس اسی نہج پر زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے جس میں ان کی ذہنی سطح کا لحاظ ہو، فنی اصطلاحات میں ان کو الجھانے کے بجائے مغز وحاصل کو آسان الفاظ میں ان کے فہم سے قریب کردیا جائے، بدیہی مثالوں کے ذریعہ مضامین عالیہ کو خوب روشن کیا جائے، زبان ایسی ہو جو مخاطبین کے ماحول ومحاورات سے ہم آہنگ ہو، سادگی وبے ساختگی کی حلاوت اس میں موجود ہو، اندازِ بیان حکمت وموعظت سے لبریز اور دردِ دل سے آراستہ ہو۔

حضرت والا کے دروسِ قرآن، نافعیت و جامعیت کی انہی خصوصیات کا نمونہ ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ سامعین کو بیک وقت یہاں علم و عمل کی تسکین کا سامان ملتا ہے، بسا اوقات گھنٹوں حضرت کے بیانات کو لوگ سنتے ہیں اور ان کے چہروں سے مطلق اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا، لوگ ہمہ تن گوش ہو کر خطاباتِ عالیہ کو سنتے ہیں اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق دامنِ مراد کو بھر لیتے ہیں، ہم نے ممکن کوشش کی ہے کہ تحریر کے قالب میں حضرت والا کے ان افادات کو قارئین کی خدمت میں پیش کریں، ہم نے حضرت کے علوم و معارف کو قلمبند کرنے میں اس کا لحاظ رکھا کہ ضبط کا انداز اصل کے مطابق خطابی رہے کیوں کہ اس کے ذریعہ ایک طرف تو قارئین حضرت والا کے اسلوب بیان سے محظوظ ہوں گے ساتھ ہی آپ کے الہامی کلمات کی برکتوں سے فیضیاب بھی ہوں گے۔

اس کے باوجود یہ بہر حال ایک بشری کاوش ہے جس میں لغزش و خطاء کا امکان بہر صورت باقی ہے، اہل علم سے درخواست ہے کہ اس میں کوئی قابلِ اصلاح بات نظر آئے تو مطلع فرمائیں ان شاء اللہ ہم ممنون و مشکور ہوں گے، اس موقع پر راقم الحروف، شریعہ بورڈ آف انڈیا کے اسٹاف میں سے برادرِ محترم مفتی محمد عطاء الرحمٰن صاحب قاسمی کا خاص طور پر مشکور ہے کہ جن کی تصحیح و تخریج کے کام میں خاص محنتیں رہیں، موصوف کے ساتھ راقم الحروف نے حضرت والا کے پانچ مجلسوں میں ہونے والے دروس کو نہایت سلیقہ سے یکجا کیا، حضرت والا کے دروس و خطابات سے استفادہ کرنے والے جانتے ہیں کہ آپ کے علم کا سیلِ رواں جب اپنی طبعی رفتار سے چلنا شروع ہوتا ہے تو آس پاس کے بہت سے قطعاتِ علوم و فنون کو سیراب کر جاتا ہے، ہم نے ایک مفید کام یہ کیا کہ صرف موضوع سے متعلق مواد کو برقرار رکھا اور باقی کو یہاں سے حذف کر دیا، بعض بعض جملوں کی نوک و پلک بھی سنوارنے کی حتی الامکان کوشش کی، پوری محنت سے المکتبۃ الشاملہ کے ذریعہ آیات و روایات کی تخریج سے اسے آراستہ کیا جس سے ان دروس کی اہمیت و افادیت مزید بڑھ گئی، نیز مفتی انعام الحق صاحب قاسمی کے مفید مشوروں اور مفتی عبد الرؤف صاحب قاسمی کا بھی تصحیح میں قابلِ

قدر تعاون شامل رہا، اللہ تبارک و تعالیٰ سب کو بہترین بدلہ عطا فرمائے، الحمد اللہ آج اس کام کو انجام دیتے ہوئے جو خوشی اور مسرت ہے اُسے الفاظ میں ادا نہیں کیا جاسکتا اور باری تعالیٰ کا اس پر جس قدر شکر ادا کیا جائے کم ہے، اخیر میں میں محترم جناب عارف اقبال صاحب کا مشکور ہوں کہ جن کا حضرت کے خطبات کو ریکارڈنگ کے ذریعہ جمع کرنے اور اس کو کتابی شکل دینے میں کافی تعاون رہااور جناب سید صاحب اور محترم جناب سید نذیر احمد صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ اُنہوں نے کمپوزنگ کے تمام مراحل بحسن و خوبی انجام دیئے ہیں۔ دعاء ہے کہ اللہ تبارک و تعالی حضرت والا کے مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائے اور حضرت کا سایہ سلامتی کے ساتھ ہم پر تادیر قائم رکھے اور ان دروس کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت سے نواز کر خلق کے لیے اس کتاب کو نافع اور ہمارے لیے ذریعۂ نجات بنائے۔ آمین

محمد رضاء الرحمن عابد

ابن

حضرت مولانا شاہ مفتی محمد نوال الرحمن صاحب دامت برکاتہم

أعوذ باللہ من الشّیطٰن الرّجیم. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ.

اللّٰهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ. لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ. اللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُمْ مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ۔ (البقرۃ:۲۵۵تا۲۵۷)

مفسرین نے آیۃ الکرسی کے ساتھ اس کے بعد والی دو آیتوں کو بھی اسی میں شمار فرمایا ہے، کیونکہ مضمون اور مفہوم کے اعتبار سے دونوں میں بہت زیادہ قریبی ربط پایا جاتا ہے۔ ویسے تو پورا کلام ہی خوب مربوط ہے کہ ایک آیت دوسری آیت سے، ایک رکوع دوسرے رکوع سے، ایک سورت دوسری سورت سے، تاہم بعض آیتوں کا مفہوم آپس میں ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں آیۃ الکرسی کے بعد والی دو آیتوں کا بہت قریبی تعلق ہے۔ اس لیے سورہ بقرہ کی تین آیتیں ۲۵۵،۲۵۶ اور ۲۵۷ تلاوت کی گئی ہیں۔

آیۃ الکرسی کے حفظ و تلاوت کا اہتمام

پورے قرآن پاک میں سورۂ بقرہ اور سورۂ بقرہ میں آیۃ الکرسی بہت مہتم بالشان اور عجیب و غریب آیت ہے۔ آیۃ الکرسی کے جو فضائل احادیث میں بیان کیے گئے ہیں اُن کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی بالخصوص اس آیت سے بہت شغف رکھے، اس کو خوب پڑھے اور ایک مسلمان کو یہ آیت یاد ہونی ہی چاہیے۔ ابھی جب میں اس کے فضائل کا تذکرہ آپ کے سامنے کروں گا

تو آپ اندازہ کریں گے کہ آیت الکرسی اللہ کی نظر میں اور اللہ کے حبیب ﷺ کی نظر میں کتنی مہتم بالشان ہے پھر یہ احساس ہو گا کہ جب یہ اتنی مہتم بالشان اور اتنی محبوب ہے تو پھر مجھے ضرور یاد کرنی چاہیے اور پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

"آیۃالکرسی" کے فضائل

تفسیر نسفی میں امام نسفی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت نقل کی ہے۔ حضور پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو سَیِّدُ الْبَشَرْ یعنی تمام بشریت کا سردار بنایا بایں معنی کہ وہ انسانوں کے والد ہیں اور سَیِّدُ الْعَرَبِ مُحَمَّدْ ﷺ یعنی آپ کے بارے میں بتلایا کہ آپ عربوں کے سردار ہیں۔ [1]

یہ خصوصیت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ورنہ حضور ﷺ سیّد العرب بھی ہیں، سیّد آدم بھی ہیں، سیّد البشر بھی ہیں اور سیّد الخلق بھی ہیں یعنی تمام مخلوق کے سردار ہیں۔ بعض مرتبہ کسی روایت میں کسی خاص بات اور خاص وصف کی رعایت کرتے ہوئے فضیلت اور مرتبہ کو بیان کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے دوسری روایتوں کے مقابلے میں فرق معلوم ہوتا ہے۔ مفسرین اور محدثین اس مفہوم کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ جیسے یہاں پر کہا گیا کہ سَیِّدُ الْعَرَبِ مُحَمَّدْ ﷺ ہیں۔

کبھی ایسا ہوتا تھا کہ آپ ﷺ کی جو فضیلتیں ہیں وہ درجہ بدرجہ بتائی گئیں، پہلے ایک وحی نازل ہوئی، پھر اُس کے بعد دوسری وحی، پھر تیسری وحی دھیرے دھیرے بات بڑھتی چلی گئی۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی یہاں پر بھی ہوا ہو کہ پہلے حضور ﷺ کا سیّد العرب ہونا بتایا گیا، پھر

---

[1]: تفسیر نسفی:۱ /۱۳۰۔

اُس کے بعد آپ ﷺ کا سیّد البشر ہونا بتایا گیا، پھر اُس کے بعد آپ ﷺ کا سیّد الخلق ہونا بتایا گیا ہو۔

امام نسفی رحمۃ اللہ علیہ نے جس روایت کی تخریج کی ہے اُس میں یہ مضمون ہے کہ سَیِّدُ الْبَشَرِ آدم ہیں اور سَیِّدُ الْعَرَبِ محمد (ﷺ) ہیں، سَیِّدُ الْفَرَسِ یعنی فارسیوں کے سردار سلمان ہیں اور سَیِّدُ الرُّوْمِ یعنی رُوم کے سردار صہیب ہیں، سَیِّدُ الْحَبَشَۃِ یعنی حبشہ کے سردار بلال ہیں، سَیِّدُ الْجِبَالِ الطُّوْرُ یعنی پہاڑوں کا سردار طور ہے، سَیِّدُ الْاَیَّامِ یَوْمُ الْجُمُعَۃِ یعنی دنوں کا سردار جمعہ کا دن ہے، سَیِّدُ الْکَلَامِ الْقُرْآنُ یعنی کلاموں کا سردار قرآن ہے، سَیِّدُ الْقُرْآنِ الْبَقَرَۃُ یعنی قرآنی سورتوں کی سردار بقرہ ہے، وَسَیِّدُ الْبَقَرَۃِ آیَۃُ الْکُرْسِیِّ اور سورۂ بقرہ کا سردار آیۃ الکرسی ہے۔ آپ ﷺ فرمایا کہ جو آدمی اس کی تلاوت کرتا ہے تو تیس دن تک شیطان کی شرارت سے محفوظ کر دیا جاتا ہے اور چالیس دن جادو کے اثر سے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔[۱] آپ ﷺ نے آیۃ الکرسی کی فضیلت اس ترتیب سے بیان فرمائی تو اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قرآن پاک کی سب سے عظیم آیت

ایک مرتبہ حضور ﷺ نے حضرت اُبی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ: بتاؤ! قرآن پاک کی سب سے عظیم آیت کون سی ہے؟ حضرت اُبی ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اَقْرَؤُھُمْ (أقرأ هذه الأمة) ہیں[۲] یعنی اُبی ابن کعب اِس اُمت کے سب سے بڑے قاری ہیں۔ حضور ﷺ نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ایسی تربیت دی تھی کہ وہ کمالات کے جامع تھے مگر کسی کسی میں کوئی کمال بہت ہی نمایاں تھا۔ جیسے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا

---

[۱] (تفسیر النسفی: ۱/ ۱۳۰) [۲] (سنن ترمذی: ۴۱۵۹)

کہ اَمِیْنُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ [1] یہ اِس اُمت کے امین ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ امانت کی صفت تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ وصف خلفائے راشدین اور دوسروں میں نہیں تھا بات یہ ہے کہ یہ وصف اُن میں ایک عجیب وغریب انداز میں نمایاں تھا۔ وَ أَقْضَاهُمْ عَلِیٌّ [2] فیصلے کرنے کے اعتبار سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صفت سب سے زیادہ نمایاں تھی حالانکہ دوسروں میں بھی فیصلہ کرنے کی صلاحیت تھی۔ حضرت صدیق اکبر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے فیصلے مشہور ہیں۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ وہ "اَزْهَدُ" ہیں [3] یعنی سب سے زیادہ زاہد ہیں۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا أَعْلَمُهُمْ بِالْحَلَالِ وَ الْحَرَامِ کہ وہ سب سے بڑے مفتی ہیں۔ [4] فتوے کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے اُن کو ایک نمایاں علم دیا ہے۔ اسی طریقے پر حضرت اُبی ابن کعب رضی اللہ عنہ کو "اَقرأ" کہا گیا یعنی وہ سب سے بڑے قاری ہیں، تو جب حضور ﷺ نے ان سے سے پوچھا توانہوں نے کہا: "اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ" صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک عادت تھی کہ باوجود معلوم ہونے کے "اللہ ورسولہ اعلم" کہتے تھے۔ اس لیے کہ پوچھنے کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کچھ بتلانا چاہتے ہیں، جب آپ بتلانا چاہتے تو طلب پیدا کر رہے ہیں۔ جب طلب پیدا کر رہے ہیں تو طلب کا اظہار ہونا چاہیے۔ ایسا نہیں کہ آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں ہے ہم کو پہلے سے معلوم ہے۔ یہ طریقہ ادب کے خلاف ہے۔ اس لیے جب حضور ﷺ حضراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے کوئی بات پوچھتے تو معلوم ہونے کے باوجود صحابہ اُس کو اللہ اور رسول کی طرف منسوب کرتے اور کہتے کہ "اللہ اور اُس کے رسول زیادہ جانتے ہیں"

۱: حوالۂ سابق۔ ۲: سنن ابن ماجہ: ۱۵۴۔ ۳: المطالب العالیۃ لابن حجر: ۴۱۰۰۔ ۴: سنن ترمذی: ۴۱۵۹۔

حضور ﷺ نے دوسری مرتبہ پوچھا، پھر تیسری مرتبہ پوچھا۔ تیسری مرتبہ حضرت اُبی ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: "آیۃ الکرسی"۔ پورے قرآن پاک کی سب سے افضل آیت ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ابوالمنذر! (حضرت اُبی ابن کعب کی کنیت ہے) تم کو علم مبارک ہو (یعنی تم نے قرآن پاک میں سب سے افضل اور بہترین آیت کون سی ہے، اس کو جان لیا) یعنی یہ بالکل صحیح بات ہے، اس لیے آپ ﷺ نے بشارت اور خوشخبری دی۔ پھر فرمایا کہ یہ ایسی آیت ہے کہ اس کی ایک زبان اور دو ہونٹ ہیں، اور فرشتہ عرش کی پنڈلی کے پاس اس کو پڑھتا ہے۔ [۱]

حاملانِ عرش فرشتے اس آیت الکرسی کو پڑھ کر اللہ تبارک وتعالیٰ کا تقرب حاصل کرتے ہیں، قاری ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس کا یہ مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قریب ترین فرشتوں کے لیے یہ تجویز فرمایا ہے کہ وہ اس کو پڑھیں اور جو جتنا پڑھے گا اللہ تعالیٰ اُس سے اتنا خوش ہو گا، اور جس سے اللہ تبارک وتعالیٰ خوش ہوں گے اللہ تبارک وتعالیٰ اُس کو قرب عطا فرمائیں گے۔

"آیۃ الکرسی" اور اجازتِ نکاح

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ایک آدمی سے پوچھا کہ تمہاری شادی ہو گئی؟ اُس نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! میری شادی نہیں ہوئی۔ فرمایا کہ شادی کیوں نہیں ہوئی؟ تمہیں شادی کر لینی چاہیے تھی۔ اُس نے کہا کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔

۱: سنن بیہقی:۱۲۱۔

عربوں میں دو قسم کے مہر دینے کا رواج تھا۔ ایک مہر معجل یعنی بیوی کو فوری طور پر کچھ نہ کچھ دینا اور آج بھی یہ رواج اُن کے پاس ہے۔ ایک مہر مؤجل یعنی جو بھی مقرر ہو تا اُسے بعد میں اطمینان سے دیتے۔ بیوی کو فوری طور پر کوئی چیز دیے بغیر اُس کے پاس جانے کو عام طور پر غیرت کے خلاف سمجھتے تھے۔ مہر معجل میں معمولی سی چیز بھی ہوا کرتی تھی، ضروری نہیں ہے کہ بہت ہی قیمتی چیز ہو۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ کیا تمہارے پاس سورۃ الکافرون نہیں ہے ؟ اُنہوں نے کہا کہ وہ تو میرے پاس ہے۔ پھر فرمایا کہ کیا تمہارے پاس سورۂ اخلاص نہیں ہے ؟ کہا کہ میرے پاس سورۂ اخلاص بھی ہے۔ فرمایا کہ یہ ثلث القرآن ہے۔ پھر اُس کے بعد دریافت کرتے کرتے آپ ﷺ نے پوچھا کہ کیا تمہیں آیۃ الکرسی یاد نہیں ہے ؟ کہا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے یاد ہے۔ فرمایا کہ یہ ربع القرآن ہے، قرآن کا ایک چوتھائی تمہارے پاس ہے اور تم کہہ رہے ہو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ کسی عورت سے نکاح کی بات کرو اور بتاؤ کہ میں تمہیں آیۃ الکرسی یاد کرادوں گا۔ [1]

یہ اتنی عظیم الشان آیت ہے کہ حضور ﷺ نے اس آیت پر شادی کرنے کی اجازت دے دی، اگر کسی کو یہ آیت یاد ہے تو عورت کو یاد کرواؤ اور شادی کر لو۔

اسقاطِ مہر بندے کا حق نہیں

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے مہر معاف ہو جائیگا۔ مہر الگ چیز ہے۔ قرآنِ پاک میں ارشادِ ربانی ہے:

قَدۡ عَلِمۡنَا مَا فَرَضۡنَا عَلَيۡهِمۡ فِيٓ أَزۡوَٰجِهِمۡ [2] ہم کو معلوم ہے کہ ہم نے ان پر بیویوں کا مہر مقرر کیا ہے

---

[1]: شعب الایمان:۲۲۸۵۔ [2]: الاحزاب:۵۰۔

علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی اس شرط پر شادی کر لے کہ میں مہر نہیں دوں گا تو بھی مہر دینا پڑتا ہے، کیونکہ جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے اُسے بندہ ساقط نہیں کر سکتا البتہ اگر عورت معاف کر دے تو معاف ہو جائیگا[1] ۔ یہ مہر صرف قرآن پاک کے یاد کرانے سے بھی معاف نہیں ہوتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے طے فرما دیا وہ تو اپنی جگہ پر ہے، لیکن چونکہ شادی کے لیے پہلے پیش قدمی کرنے کا رواج مال نہ ہونے کی صورت میں نہیں تھا تو حضور ﷺ نے ترغیب دی تھی کہ تم قرآن پاک کی کسی آیت کو یاد کروا کر شادی کر سکتے ہو جس میں آپ ﷺ نے آیۃ الکرسی کو خاص طور پر بیان فرمایا۔

اس حدیث سے اتنا مفہوم سمجھ میں آیا کہ حضور ﷺ نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دلوں میں اس کی اتنی اہمیت بٹھائی اور حضور ﷺ کے نزدیک اس آیت کی اتنی اہمیت تھی کہ آپ ﷺ نے اس کا باضابطہ سوال کیا اور اس کا جواب حاصل ہونے پر آپ ﷺ نے انہیں اجازت دی کہ تم اپنے اندر تو شادی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔

تحیۃ المسجد کی شرعی حیثیت

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے۔ میں آپ کی خدمت میں بیٹھ گیا۔ آپ ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ اے ابوذر! تم نے نماز پڑھ لی۔ میں نے کہا کہ نہیں پڑھی۔

مسجد میں حاضر ہوتے ہی نماز پڑھنا چاہیے، چاہے آپ نماز کے لیے آئے ہوں یا کسی اور کام کے لیے آئے ہوں۔ جس کو مسجد کہتے ہیں اگر آدمی اُس میں آئے تو اُسے تحیۃ المسجد پڑھنا چاہیے۔ آدابِ مسجد اور آدابِ دربارِ شاہی میں سے یہ بات ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے

۱: فتاویٰ ہندیہ: الفصل الثانی فیما یتأکد بہ المہر والمتعۃ۔

نزدیک یہ پڑھنا واجب ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ سنت ہے۔ [1] اگر آدمی آتے ہی کسی نماز میں مشغول ہو جائے جیسے ظہر کے وقت میں پہنچے اور ظہر کی سنتوں کی نیت باندھ لی، عصر کے وقت میں پہنچے اور عصر کی سنتوں کی نیت باندھ لی تو اُس میں تحیۃ المسجد داخل ہو جاتی ہے۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ مسجد میں داخل ہوتے ہی عبادت میں مشغول ہو جائے۔ اگر آدمی فوری طور پر کوئی عبادت نہیں کر رہا ہے تو تحیۃ المسجد پڑھے۔ لیکن اگر داخل ہوتے ہی نماز میں شامل ہو گیا تو تحیۃ المسجد اُسی میں داخل ہو جاتی ہے۔ جیسے جماعت کھڑی ہو چکی ہے، اب تحیۃ المسجد تھوڑا ہی پڑھی جائے گی۔ غرض یہ کہ احناف کے نزدیک یہ سنت ہے۔

حضور ﷺ نے پوچھا: اے ابوذر! تم نے نماز پڑھی؟ میں نے کہا کہ نہیں پڑھی، فرمایا کہ نماز پڑھ لو۔ جب نماز سے فارغ ہو کر بیٹھے تو فرمایا **تَعَوَّذْ بِاللّٰہِ مِنْ شَرِّ شَیَاطِیْنِ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ**، پناہ مانگو شیاطین سے جو جنات و انسان میں سے ہیں۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! کیا انسانوں میں بھی شیاطین ہوتے ہیں؟ فرمایا کہ ہاں!۔ اس کے بعد حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ نماز کے بارے میں کچھ فرمایئے۔ فرمایا: **خَیْرُ مَوْضُوْعٍ**، اللہ تعالیٰ نے جتنے احکام کی چیزیں دی ہیں اُن میں سب سے بہترین چیز نماز ہی ہے۔ پھر کہا کہ روزے کے بارے میں کچھ فرمایئے۔ فرمایا کہ روزہ اللہ تعالیٰ کا ایسا فرض ہے جس پر عجیب جزا دی جائے گی کہ اللہ تعالیٰ نے اُس پر مزید دینے کا وعدہ کیا ہے، پھر کہا کہ صدقہ کے بارے میں کچھ ارشاد فرمائیں۔ فرمایا کہ صدقہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ **اَضْعَافٌ مُضَاعَفَۃٌ** جتنا آدمی دے گا اُس میں بڑھوتری ہوتی ہی چلی جائے گی۔

---

[1]: ردالمحتار: مطلب فی تحیۃ المسجد۔

صدقہ میں بندے کو ایسی چیز دی گئی ہے کہ اگر آدمی صدقہ کرے تو وہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔[۱] حدیث میں آیا ہے کہ جب کوئی بندہ اخلاص کے ساتھ صدقہ کرتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اُس کو اپنے دست مبارک پر پالتے ہیں، "كَمَا يُرَبِّيْ أَحَدُكُمْ فَلُوَّهُ"، جیسے تم میں سے کوئی اپنے گھوڑے کے بچے کو پالتا ہے۔ پھر اُس کو پال کر پہاڑ سے بھی بڑا بنادیتے ہیں۔[۲] وہ کہے گا کہ میں نے تو اتنا نہیں دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے اُس کو پالا اور اتنا بڑا کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں قسم کھاکر کہتا ہوں کہ صدقے سے کبھی بھی مال میں کمی نہیں آئے گی۔[۳]

صدقہ کی طاقت

ایک روایت میں ہے۔ جب پہاڑ بنائے گئے تو فرشتوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے عرض کیا، اے اللہ! آپ نے اتنے عظیم پہاڑ بنائے ہیں، کیا آپ نے اس سے بھی زیادہ طاقتور کوئی مخلوق بنائی ہے؟ فرمایا کہ ہاں! لوہا بنایا ہے کہ لوہا پہاڑ کو توڑ دیتا ہے۔ پوچھا کہ کیا آپ نے لوہے سے بھی زیادہ طاقتور کوئی چیز بنائی ہے؟ فرمایا کہ ہاں! میں نے آگ بنائی ہے، آگ لوہے کو پگھلا دیتی ہے۔ پوچھا کہ کیا آپ نے آگ سے بھی زیادہ طاقتور کوئی مخلوق بنائی ہے؟ فرمایا کہ ہاں! میں نے پانی بنایا ہے کہ پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ پوچھا کہ کیا آپ نے پانی سے بھی زیادہ طاقتور کوئی مخلوق بنائی ہے؟ فرمایا کہ ہاں! میں نے ہوا بنائی ہے، ہوا پانی کو اُڑا دیتی ہے۔ پوچھا کہ کیا آپ نے ہوا سے بھی زیادہ طاقتور مخلوق بنائی ہے۔ فرمایا کہ ہاں! ابن آدم کا صدقہ، یہ ہوا سے بھی زیادہ طاقتور ہے، یہ جہنم کی آگ کو بجھا دیتا ہے۔[۴]

۱: تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۷۳۔ ۲: صحیح البخاری: ۱۴۱۰۔ ۳: سنن ترمذی: ۲۳۲۵۔ ۴: سنن ترمذی: ۳۳۶۹۵۔

تو غرض یہ کہ پھر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ انبیاء میں سب سے پہلے کون ہیں؟ فرمایا کہ آدم۔ پوچھا کہ کیا وہ نبی تھے؟ فرمایا کہ جی ہاں! وہ نبی تھے۔ پھر پوچھا کہ رسول کتنے آئے ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تین سو تیرہ اور ایک روایت میں ہے تین سو پندرہ اور بہت آئے۔ پھر اس کے بعد حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ قرآن پاک میں سب سے عظیم آیت کون سی نازل ہوئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "آیۃ الکرسی"۔ [1] نجی محفلوں میں بھی جب صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے قرآن پاک کی آیتوں کی فضیلتوں کے بارے میں کوئی بات پوچھی تو آپ ﷺ نے فرمایا"آیۃالکرسی"۔

"آیۃالکرسی" جان ومال کی حفاظت کا باعث

حضور ﷺ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ کے لیے آئی ہوئی کھجوروں کی نگرانی پر ذمہ دار بنادیا تھا۔ اس میں دو قسم کا مضمون ملتا ہے۔ اس میں سے ایک مضمون یہ ہے کہ ایک دن انہوں نے کمرہ کھولا تو جھولا اُن کو خالی نظر آیا۔ انہوں نے حضور ﷺ سے شکایت کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ اُسے پکڑو۔ عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں چاہتا ہوں کہ اُس کو پکڑوں۔ فرمایا کہ جب تم دروازہ کھولو تو کہنا کہ بِسْمِ اللّٰہِ اَجِیْبِیْ رَسُوْلَ اللّٰہِ، اللہ کے نام سے اللہ کے رسول کا جواب دے یعنی اللہ کے رسول تجھے بلارہے ہیں تو قبضے میں آجا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ "سُبحانَ مَنْ سَخَّرَکَ لِمُحَمَّدٍ"، پاک ہے وہ ذات جس نے تجھ کو محمد ﷺ کے لیے مسخر کردیا۔ کہتے ہیں کہ جب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے دروازہ کھولتے ہی پڑھا تو ایک آدمی کو کھڑا ہوا دیکھا، اُس کو پکڑ لیا۔ پوچھا کہ تو کون ہے؟ اُس نے کہا میں کثیر العیال ہوں، ضرورت مند ہوں، میں یہ لے جارہا تھا،

---

[1]: تفسیر ابن کثیر: ۱ / ۶۷۳۔

آپ نے مجھے پکڑ لیا، مجھے چھوڑ دیجیے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں تجھے حضور ﷺ کے پاس لے جاؤں گا۔ اُس نے کہا کہ آپ مجھے چھوڑ دیجیے، میں آپ کو ایک عجیب چیز بتاؤنگا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے بتادو!۔ اُس نے کہا کہ جب آپ اپنے بستر پر پہنچیں تو آیۃ الکرسی پڑھ لیا کریں، جب آپ آیۃ الکرسی پڑھ لیں گے تو کوئی بھی یہ چیز نہیں لے جاسکتا۔ انہوں نے اُسے چھوڑ دیا۔ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تمہارے قیدی کا کیا ہوا؟ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میں نے اُس کو پکڑ لیا تھا، اُس نے مجھ سے کہا کہ مجھے چھوڑ دیں، میں کثیر العیال ہوں، میں آپ کو ایک چیز بتاؤں گا اور کہا کہ آیۃ الکرسی پڑھنے سے اللہ کی جانب سے نگراں مقرر ہو جاتا ہے اور شیطان صبح تک تیرے قریب نہیں آسکے گا اور یہ سب محفوظ ہو جائے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

"اَمَا اِنَّهٗ كَذُوْبٌ وَ قَدْ صَدَقَكَ" وہ تو جھوٹا ہے لیکن اس نے تجھ سے سچ کہا۔ پھر دریافت فرمایا کہ اے ابوہریرہ! اُس کو جانتے ہو، وہ کون تھا؟ عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نہیں جانتا۔ فرمایا کہ وہ شیطان تھا۔ [1]

یہ واقعہ دوسرے صحابہ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ ایک مرتبہ حضرت اُبی ابن کعب رضی اللہ عنہ کے ساتھ، ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ۔ اسی وجہ سے اس واقعے کو بیان کرنے میں مختلف الفاظ پائے جاتے ہیں۔ ایک روایت میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کے سورۂ بقرہ میں ایک آیت ہے جو تمام آیاتِ قرآن کی سردار ہے جس گھر میں وہ پڑھی جاتی ہے شیطان اس سے نکل جاتا ہے وہ آیۃ الکرسی ہے [2] سب صحابہ کے واقعات

---

[1]: سنن کبریٰ للنسائی: ۱۰۷۹۵۔ [2]: مستدرکِ حاکم: ۲۰۵۹۔

میں ایسا ہوا کہ جن ان کے سامان میں سے کچھ لے جا رہا تھا اور اُس نے خود بتایا کہ اگر آپ آیۃ الکرسی پڑھ لیا کریں تو ہم میں اسے لینے کی طاقت باقی نہیں رہتی۔

آیۃ الکرسی اللہ تبارک وتعالیٰ کا کس قدر انعام ہے، اسے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت سے پڑھنا چاہیے اور اسی طرح اس کے پڑھنے میں یہ فائدہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کی برکت سے آدمی کا مال بھی محفوظ ہوتا ہے اور آدمی کی جان بھی محفوظ ہوتی ہے۔ ایک روایت میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو آدمی سورۂ حم اور آیۃ الکرسی پڑھے گا، اگر صبح پڑھے گا تو شام تک اُس کی حفاظت کی جائے گی اور شام کو پڑھے گا تو صبح تک اُس کی حفاظت کی جائے گی۔ [۱]

آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ آیۃ الکرسی کے پڑھنے والے پر ایک فرشتہ مقرر کیا جاتا ہے جو اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کی حفاظت فرشتوں کے ذریعے سے کرواتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ خود حافظ ہیں لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک عادت ہے کہ انہوں نے دنیا کو دارالاسباب بنایا ہے، یہاں ہر کام اُن کے حکم سے ہوتا ہے اور وہ مختلف مخلوق سے کام لیتے ہیں۔ ایک فرشتہ اس پر مقرر ہوتا ہے کہ صبح آیت الکرسی پڑھنے والے کی شام تک حفاظت کی جائے۔ شام میں پڑھنے والے پر ایک فرشتہ مقرر کر دیا جاتا ہے کہ صبح تک اُس کی حفاظت کرے۔ [۲] یہ خود اتنی بڑی فضیلت ہے کہ ہر آدمی کو اس کی ضرورت پڑتی ہے اور ہر آدمی محتاج ہے کہ اُس کی حفاظت ہو۔

فرشتوں کے ذریعے انسان کی حفاظت

حضور ﷺ نے فرمایا کہ جنات اتنے کثیر ہیں کہ زمین پر شاید ہی کوئی جگہ اُن سے خالی ہو، اگر اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعے سے انسانوں کی حفاظت نہ فرماتے تو یہ جنات ہی انسانوں کو مار ڈالتے۔ [۳]

۱: سنن ترمذی: ۳۱۲۰۔ ۲: صحیح بخاری: ۲۳۱۱۔ ۳: روح المعانی: ۲ / ۱۳۲۔

کیونکہ جنات باعتبار جثہ کے طاقتور ہیں، اسی لئے فرشتوں سے انسانوں کی حفاظت ہوتی ہے۔ اسی طرح حشرات اور درندوں سے انسان کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ فرشتوں کو مقرر فرماتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کی مصلحت ہوتی ہے تو حفظہ (حفاظت کرنے والے فرشتے) ہٹا لیے جاتے ہیں [۱] تب کسی کو سانپ کاٹتا ہے۔ فرشتے کی موجودگی میں کسی کو سانپ نہیں کاٹ سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی مصلحت ہوتی ہے اور فرشتے کو اللہ کا حکم ہوتا ہے کہ تو اب اس کی حفاظت مت کر، اس کو یہ تکلیف پہنچانا ہے، اس کے لیے یہ طے ہے تو تکلیف پہنچتی ہے ورنہ نہیں پہنچتی ہے۔ جنات انسان کو دیکھتے ہیں جبکہ انسان جنات کو نہیں دیکھ سکتے۔ جو جنات شریر ہوتے ہیں وہ انسان کے دُشمن ہوتے ہیں، انسان کو دیکھ بھی رہے ہیں، دُشمن بھی ہیں اور طاقت بھی زیادہ ہے اور انسان اُس کو دیکھ بھی نہیں رہا اور کمزور بھی ہے۔ ایسی صورت میں یہ جنات پہلے ہی انسانوں کو کھا جاتے، لیکن حق تعالیٰ نے حفاظت کا انتظام فرمایا ہے۔ اسی لیے جب آدمی بستر پر پہنچے تو اُس کو آیت الکرسی پڑھنی چاہیے، حضور پاک ﷺ نے اس کی ترغیب دی ہے۔

حضور ﷺ کی حفاظت آیۃ الکرسی سے

آپ اندازہ کیجیے کہ خود امام الانبیاء ﷺ جن کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا کہ ہم آپ کی حفاظت کرنے والے ہیں، قرآن پاک میں واضح ہے:

يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔ [۲]

اے رسول! آپ تبلیغ کیجیے جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا ہے اُس کی، اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو گویا آپ نے رسالت کے فرض کو ادا نہیں کیا (جہاں تک حفاظت کا تعلق ہے تو) یقیناً اللہ

۱: تفسیر ابن رجب الحنبلی: ۱ /۵۷۵۔ ۲: المائدۃ: ۶۷۔

آپ کی حفاظت کرے گا لوگوں سے۔ پھر بھی آپ ﷺ اس کو پڑھ کر اپنے اوپر دم کرتے تھے۔

پہلے حضور ﷺ کے دربان ہوتے تھے، کوئی آپ کی نگرانی پر مامور ہو جاتا تھا، آپ ﷺ کے درِ دولت کے باہر کوئی کھڑا ہو جاتا تھا تاکہ حفاظت کی جائے۔ بالخصوص اُس وقت جب دُشمنوں کی طرف سے شورش اور شرارتیں بڑھنے لگیں، جب یہ آیتِ کریمہ نازل ہوگئی تو فرمایا کہ جاؤ! تم لوگ اپنے اپنے گھروں کو جاؤ، اللہ تعالیٰ نے میری حفاظت کا وعدہ فرمالیا ہے۔ [۱] یہ حفاظت حضور ﷺ کی ہر چیز سے تھی۔ حضور ﷺ کی اس طرح حفاظت کے باوجود آپ ﷺ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جو اسبابِ عادیہ ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے جس کو جس چیز کا سبب بنایا ہے، آپ ﷺ اُس کو چھوڑتے نہیں تھے۔ طبیعت خراب ہوگئی تو دوا کھالی۔ گھوڑے اور اونٹ پر کہیں گئے ہیں تو اُنہیں باندھ دیا۔ حتیٰ کہ جب براق پر گئے تو براق کو بھی باندھ دیا۔ [۲] ایسے ہی آپ ﷺ رات کو سوتے وقت اُن تمام سورتوں کو پڑھتے اور ہاتھ پر تین دفعہ دَم فرماتے اور پورے جسم پر پھیر لیا کرتے تھے، جس سے شیطانوں سے حفاظت ہوتی ہے، جنات سے حفاظت ہوتی ہے، حشرات اور سباع وغیرہ سے حفاظت ہوتی ہے۔ [۳] آدمی سو رہا ہے اور ممکن ہے کان میں کوئی چیز گھس جائے۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کی مدد لینے کی ضرورت ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی مدد کا راستہ اس طرح بنایا ہوا ہے۔ اس لئے سوتے وقت معوذتین، سورۂ اخلاص، سورۃ الکافرون اور آیۃ الکرسی وغیرہ کو پڑھنا چاہیے۔

آپ ﷺ کی عادتِ مبارکہ تھی کہ آپ فضائل والے علم سے عمل کا شوق اتنا زیادہ پیدا کردیتے تھے کہ آدمی اُس پر عمل کرنے کے لیے بے چین ہو جاتا تھا۔ اسی لیے شروع میں

۱: سنن ترمذی:۳۰۴۶۔ ۲: صحیح مسلم:۲۵۹۔ ۳: صحیح بخاری:۵۰۱۷۔

فضائل والا علم دیا گیا۔ مسائل سے پہلے فضائل اس لیے بتائے جاتے تھے کہ طبیعتوں میں عمل کا شوق پیدا ہو جائے۔ آپ ﷺ نے آیۃ الکرسی کی بڑی فضیلت بیان فرمائی کہ آدمی شیطان کے شر سے اور مصیبتوں و پریشانیوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ یہ دنیاوی اعتبار سے فائدہ ہے۔ اُخروی اعتبار سے کیا فائدہ ہے؟

"آیۃ الکرسی" جنت میں دخولِ اولی کا باعث

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی ہر نماز کے فوراً بعد آیۃ الکرسی پڑھے گا تو جنت میں داخل ہونے کے لیے اُس کو کوئی چیز مانع نہیں ہے سوائے موت کے۔

مَنْ قَرَأَ آيَةَ الْكُرْسِيِ دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ مَكْتُوْبَةٍ لَمْ يَمْنَعْهُ مِنْ دُخُوْلِ الْجَنَّةِ إِلَّا أَنْ يَمُوْتَ [۱]

جو کوئی ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھے گا، جنت میں داخل ہونے سے کوئی چیز حاجب اور رکاوٹ نہیں ہے سوائے موت کے۔

محدثین نے فرمایا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی برکت سے دخولِ اوّلی یعنی پہلے ہی مرحلے میں جنت میں داخلہ نصیب ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب صرف موت ہی جنت میں داخل ہونے کا فاصلہ بنی ہوئی ہے اور کوئی رکاوٹ نہیں ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوا کہ اُس کو کوئی مصیبت نہ تو قبر میں پیش آئے گی اور نہ حشر میں پیش آئے گی بلکہ جنت والے حالات سے اُس کو قبر ہی میں آرام دیا جائے گا۔ اگر آیۃ الکرسی کی کوئی اور فضیلت نہ بھی ہوتی تو صرف یہی فضیلت اسکی اہمیت بتانے کے لئے کافی ہوتی، اسلئے ہر شخص ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی اہتمام سے پڑھا کرے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث ہیں، اُن میں سے چند آپ کے سامنے اس لیے پیش کی گئی ہیں تاکہ اس آیت کریمہ کی عظمت اور اہمیت ہمارے دلوں میں آجائے،

۱: سنن کبریٰ للنسائی:۹۸۴۸۔

اگر یہ یاد ہے تو ہر نماز کے بعد اور صبح وشام پڑھنے کا اس کا اہتمام ہو اور اگر آیۃ الکرسی یاد نہیں ہے تو ہم پہلی فرصت میں اس کو یاد کریں۔

آیۃ الکرسی کی اتنی فضیلت کیوں؟

مفسرین فرماتے ہیں کہ کیا وجہ ہے، حضور ﷺ نے اس کی اتنی فضیلت کیوں بتائی؟ اور اس کو کیوں قرآن پاک کی عظیم ترین آیت کہا ہے؟ مفسر نسفیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ آیت علومِ توحید پر مشتمل ہے، اس میں اسرارِ الوہیت اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی وحدانیت کا بیان بہت زیادہ جامع طریقے سے موجود ہے اور پوری مخلوق میں سب سے اعظم ترین چیز علمِ توحید ہے۔ توحید کا علم سب سے بڑا ہے،[1] چونکہ آیۃ الکرسی میں توحید کا علم اللہ تعالیٰ نے بہت زیادہ جامع طریقے سے سمو دیا ہے، اس لیے حق تعالیٰ نے اس آیت کو یہ شرف اور فضیلت مرحمت فرمائی۔ اس کا مفہوم یہ ہوا کہ جب علمِ توحید سب سے زیادہ فضیلت والا علم ہے تو اس کو حاصل کرنا بھی سب سے زیادہ اہم ہے اور جو علمِ توحید کو حاصل کرے گا وہ سب سے زیادہ فضیلت والا ہو جائے گا۔

علمِ توحید عظمت وبلندی کا ذریعہ

تاریخ شاہد ہے کہ جو توحید میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کو عظیم بنا دیتے ہیں۔ بہت کم لوگ اس راز کو سمجھے ہوئے ہیں کہ آیت میں توحید کا مضمون ہونے کی وجہ سے یہ آیت سب سے عظیم ہو گئی اور جس نے بھی توحید کو سب سے اہم مضمون بنایا وہ عظیم ہو گیا۔

---

[1]: تفسیر نسفی: ۱/ ۱۳۴۔

اپنے وقت میں سیّد عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ پر توحید کا سب سے زیادہ غلبہ تھا۔ اتنا غلبہ تھا کہ وہ کسی مخلوق کی حرکت کو دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ اُن کی دُعا میں ایک جملہ موجود ہے: "یااللہ! میرا کام اور جتنے کام کرنے والے ہیں سب کے کام مٹا دیجیے میری نظروں کے سامنے سے آپ کے افعال کی اکائی میں۔" یعنی کوئی بھی حرکت ہو تو اُس میں مجھے یہ نظر آجائے کہ یہ حرکت مخلوق کی نہیں بلکہ خالق کی ہے کیونکہ ہر حرکت کا خالق اللہ ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے زمانے میں حضرت مولانا الیاس صاحب اور حضرت مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہما کو جو عظمت اور بلندی عطا فرمائی اسی موضوعِ خاص توحید کی وجہ سے ہے۔ یہ لوگ توحیدِ فعلی کو بیان کرتے تھے۔

آیۃ الکرسی کو یہ شرف اور بزرگی اسی وجہ سے ہے کہ اس میں توحید کا مضمون ہے۔ اس لیے آدمی اس کو جتنا زیادہ سمجھنے کی اور اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرے گا حق تعالیٰ شانہ، اُسے اتنا عظمت سے سرفراز فرمائیں گے۔

مضامینِ آیۃ الکرسی کا اجمالی تذکرہ

اس میں دس جملے استعمال کیے گئے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی ذات کو، اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات کو، اللہ تعالیٰ کی مالکیت کو، اللہ تعالیٰ کی خالقیت اور مخلوق کی حفاظت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں بڑے عجیب مضامین ہیں۔ دیکھنے کے اعتبار سے بالکل سادہ مضمون ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی لائقِ عبادت نہیں، اللہ تعالیٰ کو نیند نہیں آتی، اللہ تعالیٰ کو اونگھ نہیں آتی، اللہ تبارک وتعالیٰ کا علم ہر چیز پر محیط ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک سفارش کرنے والا کون ہے، بظاہر یہ سادہ ہی معلوم ہوتا ہے، لیکن اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنا تعارف کروادیا۔ پوری دنیا میں اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، تو اللہ تعالیٰ کے تعارف اور علم سے بڑھ کر

بھی کوئی چیز نہیں۔ پوری دنیا میں اللہ تعالیٰ کو اپنا ذکر سب سے زیادہ پسند ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصیت ہے کہ اُن کے لیے بڑائی سزاوار ہے، کسی اور کے لیے یہ زیبا نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی اس لیے ہے کہ وہی بڑے ہیں۔ کسی اور کے لیے سزاوار نہیں ہے کہ اُس کی بڑائی اور کبریائی کا بار بار ذکر کیا جائے لیکن اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ اُن کا ذکر بار بار کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا ہی اسی لیے کیا ہے کہ مخلوق اُن کو پہچانے، اُن کا ذکر کرے، اُن کو یاد کرے، اُن کا نام لے۔ انہوں نے کروڑہا کروڑ، اربہا ارب، کھربہا کھرب مخلوق بنائی۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ یہ مخلوق اللہ تعالیٰ کی عظمت کو پہچانے، اُن کی قدرت کو پہچانے، اُن کی تعریف کرے اور اُن کا ذکر کرے۔

تخلیقِ انسان کا مقصد

اللہ تعالیٰ نے کروڑہا کروڑ، اربہا ارب، کھربہا کھرب فرشتے پیدا کیے، اُن کے کیا کام ہیں؟ آسمانِ اوّل کے فرشتے الگ عبادت میں لگے ہوئے ہیں، آسمانِ ثانی کے فرشتے الگ عبادت میں لگے ہوئے ہیں، آسمان ثالث کے فرشتے الگ عبادت میں لگے ہوئے ہیں۔ کوئی رکوع کر رہا ہے تو جب سے پیدا ہوا ہے وہ رکوع ہی میں ہے۔ کوئی سجدے میں ہے تو جب سے پیدا ہوا ہے وہ سجدے ہی میں ہے۔ کوئی سُبْحَانَ ذِیْ الْمُلْکِ وَ الْمَلَکُوْتِ کہہ رہا ہے تو وہی کہہ رہا ہے۔ کوئی سُبْحَانَ الْحَیِّ الَّذِیْ لَایَمُوْتُ کہہ کر اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کر رہا ہے[1]۔ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے اور بندہ اس کا مکلف ہے۔ ہم اس بات کو سمجھیں۔ ہم جو اس وقت کام کرنے جارہے ہیں یہ سب سے اہم کام ہے۔ بایں معنی کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے یہی چاہا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو پہچانیں اور اُن کی تعریف کریں کہ واقعی اے اللہ! آپ ہی بڑے ہیں، آپ

۱: مستدرکِ حاکم: ۴۵۰۲۔

ایسے کمال والے ہیں، آپ ایسی قدرت والے ہیں، آپ کی یہ صفات ہیں، اللہ تعالیٰ بندوں سے یہی چاہتے ہیں کہ میرے سامنے اپنے اعمال سے بھی ذلت وعاجزی کو ظاہر کریں، میری بڑائی تسلیم کریں، میرے سامنے سر جھکائیں اور اپنے قول سے بھی عاجزی ظاہر کریں۔ اور اس میں بڑے مضامین ہیں۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:

لائقِ عبادت ذات

حق تعالیٰ شانہ، ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ ایسی ذات ہے کہ اُن کے علاوہ کوئی لائق عبادت نہیں۔ ہم لوگ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" کا ترجمہ یوں کرتے ہیں، اُن کے علاوہ کوئی لائقِ عبادت نہیں مگر اس کا اصل ترجمہ یہ ہونا چاہیے کہ اللہ کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں، کیونکہ لائق عبادت کا ترجمہ کرتے ہوئے ہمارے ذہن میں وہ مضمون نہیں آتا جو الٰہ کہنے میں آتا ہے۔ ابھی لائق عبادت کا بھی جو مفہوم ذہن میں آتا ہے وہ بھی غنیمت ہے مگر ہم الٰہ کے معنی میں کہیں، پھر اُس کے بعد الٰہ کس کو کہتے ہیں یہ ہم جاننے کی کوشش کریں، پھر کہیں کہ اللہ کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں تو اُس سے جو وسعت ذہن میں آتی ہے اور جن جن چیزوں کا مفہوم ذہن میں آتا ہے وہ نسبتاً زیادہ ہوگا۔

باری تعالیٰ کی صفتِ قیومیت

اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ

جو زندہ ہیں اور زندہ رکھنے والے ہیں اور جو قائم ہیں اور قائم رکھنے والے ہیں، جو اپنی ذات میں حیات کی صفت رکھنے والا ہو اور دوسروں کو حیات دینے کی صفت رکھنے والا ہو اُسے "حَیّ" کہتے ہیں۔

اور جو اپنی ذات سے قائم ہو اور دوسروں کو قائم رکھنے والا ہو اُسے "قیوم" کہتے ہیں۔

اگر ہم اس مضمون کو تھوڑا سا سوچیں تو حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی کہ حق تعالیٰ شانہ، قیوم ہیں ذرّے سے لے کر جبرئیل تک، ذرّے سے لے کر پہاڑ تک، مشرق سے مغرب تک، شمال سے جنوب تک، تمام آسمان کی مخلوق، تمام خشکی کی مخلوق، تمام سمندر کی مخلوق، چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی مخلوق کو قائم رکھنے والے ہیں۔ ذرا مخلوق کے بارے میں سوچئے۔ جو مخلوق ہمارے علم میں ہے اُس کے مقابلے میں جو مخلوق ہمارے علم میں نہیں ہے اُس کا تو کوئی حساب ہی نہیں ہے۔ اُن تمام مخلوق کا وہ خالق ہے، ان کے وجود کا محافظ ہے، ان کی صفات کا محافظ ہے، ان کے افعال کا محافظ ہے، یہ سب قیوم میں شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ "حی" ہیں، وہ اپنی ذات سے زندہ ہیں اور زندگی دینے والے ہیں۔ وہ "قیوم" ہیں، وہ اپنی ذات سے قائم ہیں اور سب کو قائم رکھنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ تصوف میں ہمارے والد صاحب کو بھی غیر معمولی دسترس دی تھی۔ وصال کے بعد ہمارے بڑے بھائی صاحب نے والد صاحب کو خواب میں دیکھا۔ ہمارے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ وحدت الوجود کی بحث بہت زیادہ سنایا کرتے تھے۔ وصال کے چار پانچ دن بعد خواب میں نظر آئے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ صرف اُنہیں کو خواب میں نظر آئے ہوں۔ یہ بھی ایک مسئلہ ہے کہ خواب میں جو بزرگ نظر آتے ہیں وہ بزرگ نہیں ہوتے، یہ قصہ دوسرا ہوتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنا علم بعض مظاہر کے ذریعے عطا فرماتے ہیں۔ والد صاحب نے خواب میں فرمایا کہ تم وحدت الوجود نہ کہا کرو بلکہ قیوم کہا کرو، یہ دونوں ایک چیز ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ تمام مخلوقات کے وجود کے قیوم ہیں، تمام مخلوقات کی صفات کے قیوم ہیں، تمام مخلوقات کے افعال کے قیوم ہیں۔ انہوں نے سورج کو وجود دیا اور سورج کے نور کو بھی وجود دیا اور پھر اُس نور کی بقا بھی اللہ تبارک وتعالیٰ پر ہے۔ مجھے اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے

وجود بخشا، میں اور آپ موجود نہیں تھے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں وجود بخشا۔ پھر ہماری زندگی کی بقا اللہ تعالیٰ کے باقی رکھنے سے ہے، سننے، بولنے، دیکھنے، سوچنے اور محسوس کرنے کی طاقت اللہ تعالیٰ کے باقی رکھنے سے ہے، جسم کے اندرونی نظام کی طاقتیں بھی اللہ تعالیٰ کے باقی رکھنے سے ہے۔ ذات بھی اللہ تعالیٰ سے باقی ہے، صفات بھی اللہ تعالیٰ سے باقی ہیں، اعضاء سے جو کام سرزد ہورہا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ سے باقی ہے اور اس کے اثرات بھی اللہ تعالیٰ سے باقی ہیں۔ آثار، افعال اور صفات یہ سب اللہ تعالیٰ سے باقی ہیں۔ یہ ایسا علم ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وجودِ حقیقی صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کا ہے۔یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ اور اُن کی صفات کے مقابلے میں مخلوق کو ملنے والے وجود کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

قیومیت کا مطلب یہ ہے کہ وجود دینا اور وجود دینے کے بعد اُس کو باقی رکھنا۔ جتنی موجود چیزیں ہیں اُن سب کو اللہ تعالیٰ نے وجود بخشا اور وجود دینے کے بعد اُن کو باقی رکھے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن سے غیر متعلق نہیں ہیں۔ جیسے کمہار ایک برتن بناکر غیر متعلق ہوجاتا ہے، جیسے فیکٹری میں چیزیں بننے کے بعد ہمارے ہاتھوں میں آجاتی ہیں، پھر فیکٹری والوں کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، فیکٹری والا ان چیزوں کا قیوم نہیں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ مخلوق کے قیوم ہیں یعنی مخلوق کو وجود عطا فرمایا اور وجود عطا فرمانے کے بعد مخلوق کی بقا کا تعلق بھی اللہ تعالیٰ سے ہے۔ اگر ایک لحظہ اور آن کے لیے بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی توجہ ہٹ جائے تو مخلوق ختم ہوجائیگی۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کیسی ہے؟ اللہ تعالیٰ کا علم کیسا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا ارادہ کیسا ہے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ربوبیت کیسی ہے؟ اللہ تعالیٰ کی حاکمیّت کیسی ہے؟ اللہ تعالیٰ کی رزّاقیت کیسی ہے؟ آدمی کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ان تمام

صفات کا اندازہ اس وقت میں ہوگا جب آدمی الحي اورالقیوم کو سمجھے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ الحي القیوم اسمائے اعظم میں سے ہیں۔[۱]

اسمِ اعظم کی خصوصیت

حضور ﷺ نے فرمایا: کہ اسم اعظم سورۂ بقرۃ، آل عمران اور سورۂ طٰہ میں ہے، حضرت ابو امامہؓ کے شاگرد حضرت قاسمؒ کہتے ہیں کہ میں نے اس کو تلاش کیا تو میں نے ان تین آیتوں میں ان تین کلمات کو پایا، الٓمّٓ ۔ اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۔ اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ اور وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ۔[۲] یہ قرآن پاک کی تین آیتیں ہیں جن میں اسمِ اعظم چھپا ہوا ہے۔

اسمِ اعظم کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر کسی کو اسمِ اعظم کا علم ہو جائے تو آدمی اُس کے بعد جو دُعا مانگتا ہے وہ قبول ہو جاتی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جس نے تختِ بلقیس کو لایا تھا، اُس کے بارے میں علماء یہی کہتے ہیں کہ اُس کے پاس اسمِ اعظم کا علم تھا۔ بعض یہ کہتے ہیں اس سے مراد خود حضرت سلیمان علیہ السلام ہی ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اسمِ اعظم کا علم تھا۔[۳]

اللہ تعالیٰ نے اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ، میں اپنی دو صفتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اگر ہم اس کی گہرائی میں جائیں تو آدمی اس کو سوچتا رہ جائے کہ "الحي القیوم" کیا ہے، وہ کیسی قدرت اور عظمت والے ہیں۔

۱: مستدرک حاکم: ۱۸۶۱۔ ۲: مستدرک حاکم: ۱۸۶۶۔ ۳: تفسیر رازی: ۲۴ / ۵۵۶۔

عظمتِ باری کا فرشتوں پر اثر

آسمان اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے چرچراتا ہے اور اُس کے لیے سزاوار ہے کہ وہ چرچرائے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ آسمانوں میں کوئی چار انچ ایسی جگہ نہیں ہے جہاں کوئی فرشتہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت میں مشغول نہ ہو۔[۱] یہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی عظمت سے متاثر ہیں کوئی جھکا ہوا ہے، کوئی تسبیح میں ہے، کوئی سجدے میں پڑا ہوا ہے۔ اور جب سے اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا ہے اس وقت سے قیامت تک اللہ کی عبادت میں مشغول رہیں گے، کوئی تو قیامت تک رکوع میں ہوگا، اور کوئی سجدہ میں ہوگا، اور کوئی قیام میں ہوگا، اور جب قیامت قائم ہوگی اس وقت یہ سر اٹھائیں گے اور کہیں گے کہ اے رب ہم نے آپ کی عبادت نہیں کی جیسا کہ عبادت کرنے کا حق تھا، [۲] فرشتے اللہ تعالیٰ کی ایسی نورانی مخلوق ہے جو اتنی بڑی اور طاقتور ہے کہ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے، پھر بھی یہ باری تعالی کے سامنے سربسجود ہیں اور یہ کھربہا کھرب کی تعداد میں ہیں۔ پانی، ہوائیں، پہاڑ، زمین، چرند پرند سب کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے وجود بخشا اور سب اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور تقدیس میں لگے ہوئے ہیں۔

"وَإِنۡ مِنۡ شَيۡءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمۡدِهِ"

ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے

"وَلَـٰكِنۡ لَا تَفۡقَهُونَ تَسۡبِيحَهُمۡ" [۳]

لیکن تم لوگ اُن کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ تمام انسانوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے سر رگڑنے کا ذمہ دار بنایا گیا۔ تمام انسانوں پر فرض ہے کہ دن میں پانچ مرتبہ اپنی پیشانی کو رگڑیں۔

۱: سننِ ترمذی: ۲۳۱۲۔ ۲: تفسیر ابن کثیر: ۴/ ۴۴۶۔ ۳: الاسراء: ۴۴۔

ہم اپنی پیشانی کو باشعور طریقے سے تو جھکاتے ہی نہیں ہیں۔ ہمیں بچپن سے عادت ہے بس اپنا سر زمین پر مارے جارہے ہیں، مگر ایک سجدۂ شعوری ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کو امریکا کے صدر کے سامنے کھڑا کر دیا جائے کہ اس کو سجدہ کرو تو کوئی آدمی بھی اُس کو سجدہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، کیونکہ اُس کا سر اتنا عزیز ہے کہ کسی کے سامنے نہیں جھکتا۔ ٹھیک ہے، آپ اپنی جگہ پر صدر ہیں، لیکن آپ کے سامنے سر جھکایا نہیں جاسکتا۔ (جس نے جس کو جہاں تک سمجھا ہے وہاں نہیں جھکتا اور جہاں نہیں سمجھا اُس کے سامنے جھک جاتا ہے۔) کچھ لوگ پانی کے سامنے جھک جاتے ہیں لیکن جب پانی سمجھ میں آجاتا ہے کہ میں پانی کو اپنے واش روم میں لے سکتا ہوں، چاہے وہ پانی سمندر کا ہو، بھلا وہ کیا قابلِ عبادت ہے۔ آپ جس پانی سے استنجاء کرتے ہیں کیا وہ جھکنے کے قابل ہوسکتا ہے۔ اسلام نے تمام مخلوق کو ایک ساتھ سمجھا دیا کہ سب خدا کی مخلوق ہیں۔ کہیں بھی نہیں جھکنا ہے۔ اب کہاں جھکنا ہے؟ انسانوں میں امیر و غریب، عالم و جاہل، نیک و بد، حتیٰ کہ اولیاء اور انبیاء کے لیے بلکہ سب کے لیے ہے کہ تم دن میں پانچ مرتبہ ہمارے سامنے سجدہ کرو۔ سجدہ کرنا اور زمین پر ناک کو رگڑنا ،اس کے آگے کوئی گنجائش نہیں ہے ورنہ زمین میں گھس جانے کا حکم ہوتا اگر یہ عاجزی اور انکساری کی صورت ہوتی، اگر اس (سجدہ) سے بھی آگے انکساری اور ذلت کو ظاہر کرنے کا کوئی راستہ ہوتا تو انسان اس کا بھی مکلف ہوتا کہ انسان اللہ کے لیے وہ راستہ بھی اختیار کر کے دکھائے، اگرچہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی عظمت کا پورا اظہار نہیں ہے۔

انسان اور اس کی عبادت کی حقیقت

اللہ تعالیٰ اتنے عظیم ہیں کہ اُن کی عظمت کا اظہار اپنے محدود جسم سے ناممکن ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ہم جو عبادت کرتے ہیں یہ ہمارے حساب سے عبادت ہے ورنہ اللہ تعالیٰ

کی شان کے سامنے یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم گندے قطرے سے بنے ہوئے ہیں اور پھر اس وقت ہمارے اندر ناپاک خون ہے۔ ایک قطرہ باہر آ جائے تو وضو نہیں ٹھہر تا اور اگر یہی خون کا قطرہ پانی میں گر جائے تو پانی ناپاک ہو جاتا ہے۔ پیشاب اور غلاظت اندر بھرے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ چیزیں ناپاک نہیں ہیں، لیکن بساند ہے اور پھر ہمارے وجود کی حیثیت کیا ہے؟ فرمایا کہ پورے سمند میں سے ایک پانی کا قطرہ لیا جائے اور ایک قطرے میں لاکھوں جرثومے ہوتے ہیں، اُن لاکھوں جرثوموں میں سے ایک یہ کہے کہ سمندر میری وجہ سے قائم ہے یا یوں کہے کہ میری وجہ سے انسان کی زندگی قائم ہے کہ انسان مجھے پیتا ہے تو وہ زندہ ہے۔ انسان کہے گا کہ ایسے لاکھوں کروڑوں جرثومے میں پیشاب میں سے نکال دیتا ہوں۔ سمندر کے پانی کے مقابلے میں ایک قطرہ اور اُس ایک قطرے میں جو لاکھوں جرثومے پائے جاتے ہیں، اُن کی حیثیت نہیں کے برابر ہے۔ اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کی جو مخلوقات آسمانوں اور زمینوں میں ہیں اُن کے مقابلے میں میرے تنہا وجود کی حیثیت کیا ہے؟ انسان کی حقیقت ہی کیا ہے؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی حقیقت بار بار بتائی ہے؟ اور انسان پھر بھی تکبر کرتا ہے۔

فرمایا: "فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ" [1]

انسان دیکھے کہ اُس کو کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں دسیوں جگہ پر انسان کو یاد دلایا گیا ہے کہ ہم نے انسان کو کیسے پیدا کیا؟ اور تم غور وفکر کرو کہ تم کس چیز سے بنائے گئے۔

خُلِقَ مِنْ مَاءٍ دَافِقٍ، يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ [2]

اچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا جو نکلتا ہے پشت اور سینہ کے درمیان سے

---

[1]: الطارق:۵۔ [2]: الطارق:۶-۷۔

یہ مضمون متعدد جگہ پر ہے : قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ [۱]

''قُتِلَ ''کا مطلب ''مارا جائے''۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ انسان کو مارا جائے نہیں فرمارہے ہیں بلکہ یہ قرآن کا ایک اسلوب ہے۔''قُتِلَ الْإِنْسَانُ ''انسان کا ناس ہو ''مَا أَكْفَرَهُ''کیسا وہ کافر ہے، کتنا ناشکرا ہے۔

مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ [۲]

کیسی چیز سے بنایا اس کو، پیدا کس چیز سے ہوا یہ تو سوچتا ہی نہیں ۔

مِنْ نُطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ ، ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ ، ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ [۳]

نطفہ سے اسکی صورت بنائی پھر اس کو اندازے سے بنایا پھر اس کا راستہ آسان کر دیا پھر اس کو موت دی پھر قبر میں لے گیا۔

اس آگے کے مرحلے میں اس کو دیکھا جائے تو کوئی شان حماقت کی باقی رہنے کی نہیں ہے۔ حق تعالیٰ شانہ، اتنے عظیم، اتنے عظیم، اتنے عظیم ہیں کہ آدمی اُن کی عظمتوں کے کسی بھی حصے کو نہیں پا سکتا۔ ایسی عظیم ذات کے مقابلے میں آدمی اتنا چھوٹا، اتنا چھوٹا، اتنا چھوٹا ہے کہ اگر وہ اپنی صحیح حیثیت کو سمجھنے لگے تو اُس کی طبیعت چاہے گی کہ میں فنا ہو جاؤں۔

اللہ کی بڑائی نبی اور فرشتوں کی زبانی

یہی وہ چیز تھی جس کے بارے خود نبی علیہ السلام نے فرمایا:

مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ [۴]

ہم نے آپ کو نہیں پہچانا جیسے آپ کو پہچاننا چاہیے تھا۔

اور فرشتوں نے کہا:

۱: عبس:۱۷۔ ۲: عبس:۱۸۔ ۳: عبس:۱۹تا۲۱۔ ۴: روح المعاني:۹/۴۷۔

وَمَا عَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ [1]

ہم نے آپ کی عبادت نہیں کی جیسے آپ کی عبادت کرنی چاہیے تھی۔

ہزاروں سال عبادت کرنے کے بعد فرشتوں نے کہا کہ ہم آپ کو نہیں پہچان پائے، ہم نے آپ کی عبادت نہیں کی جیسا کہ عبادت کا حق تھا۔ کیونکہ جیسی معرفت ہوگی ویسی ہی عبادت ہوگی، ویسا ہی تعلق، خشیت اور خوف ہوگا۔ آدمی ویسے عبادت کے لیے آتا نہیں ہے اور جب عبادت کے لیے آتا ہے تو تکبر بھرا ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو تکبر سب سے زیادہ ناپسند ہے۔

میں یہ بات "قیومیت" پر عرض کر رہا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ "حی" ہیں، وہ زندہ ہیں، وہ اپنا وجود رکھتے ہیں اور کسی کا بھی حقیقی وجود نہیں ہے۔ اور جس کے پاس بھی وجود ہے وہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے اور وہ اُس کے پاس عارضی ہے۔ اہل کشف کا کہنا ہے کہ صرف ایک وجود ہی نہیں ملا بلکہ ایک وجود کے بعد دوسرا وجود، دوسرے کے بعد تیسرا وجود، تیسرے کے بعد چوتھا وجود، یہ تسلسل کے ساتھ ملتا ہی رہتا ہے۔ صوفیاء کرام اس کو تجدد امثال کہتے ہیں۔

مخلوقات کا وجود بطورِ تجدّدِ امثال

تجدد امثال کو اس مثال سے سمجھئے کہ ابھی کرنٹ جل رہا ہے۔ یہ کرنٹ ایک نہیں ہے کہ ایک مرتبہ کرنٹ آیا اور جل گیا بلکہ پہلا کرنٹ جل کر ختم ہوگیا، اُس کے بعد دوسرا آیا، دوسرا ختم ہوا تو تیسرا آیا، تیسرا ختم ہوا تو چوتھا آیا، تب ہی تو ہمارا بجلی کا میٹر چل رہا ہے۔ پہلے کرنٹ کے ختم ہونے کے بعد دوسرا اتنی تیزی کے ساتھ آتا ہے کہ ہمیں پہلے دوسرے کے درمیان عدم اور وجود نظر نہیں آتا بلکہ تسلسل نظر آتا ہے۔

---

[1]: شعب الإیمان:۱۶۶۔

جب آپ پانی کے نل کو کھولتے ہیں تو پہلا پانی گرنے کے بعد دوسرا پانی آتا ہے، دوسرا پانی جو گرتا ہے وہ پہلا نہیں ہوتا، ہر بعد والا قطرہ پہلے کا غیر ہوتا ہے، مگر پانی اتنے تسلسل کے ساتھ آتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ وہ ایک لمبی سی دھار ہے۔

جس طرح بجلی میں، لائٹ میں اور پانی میں تسلسل کا ایک نظام ہے تو تمام چیزیں وجود میں بھی اسی طرح ہیں۔ چاند، سورج، آسمانوں، عرش و کرسی، انسانوں، جانوروں، درندوں، حشرات الارض، سمندروں، پہاڑوں وغیرہ کو اللہ تعالیٰ نے ہی وجود دیا اور اللہ تعالیٰ ہی وجود دے رہے ہیں۔

فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ "حی" ہیں، اپنی ذات میں زندہ ہیں اور "قیوم" ہیں یعنی قائم رکھنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اونگھ اور نیند سے پاک ہیں

لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ

اللہ تبارک وتعالیٰ کو نہ نیند آتی ہے اور نہ اونگھ آتی ہے۔ جو چیز آدمی کے دماغ کو خلجان میں ڈال دیتی ہے اُس کا نام "موق" ہوتا ہے، اور جو چیز دل پر غالب آجاتی ہے اُس کا نام "سِنَہ" ہے، اور جو چیز جسم پر یعنی آنکھوں پر غالب آجائے اُس کا نام "نَوم" ہے۔ یہاں دونوں کی نفی فرمادی۔ ہو سکتا ہے کہ اگر نیند نہ آتی ہو تو اونگھ آتی ہو، یا اونگھ نہ آتی ہو تو نیند آتی ہو۔ فرمایا:

لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ

اللہ تبارک وتعالیٰ کو نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہیں کبھی نہیں تھکتے، نہ رات میں اور نہ دن میں۔ آدمی کے لیے فنا اور تھکان کا خیال آتا ہے، یہاں حق تعالیٰ

شانہ، کی اس صفت کو ظاہر کیا گیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے ہیں کہ نہ تو اُن کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند آتی ہے۔

ایک مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ نے خطبہ دیا اور فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سوتے نہیں ہیں، نہ اُن کے شایانِ شان یہ بات ہے کہ وہ سوئیں، کیونکہ سونا ایک عیب ہے، کمال نہیں ہے۔ سونا دلیل ہے کہ آدمی تھک گیا اور تھکان کو دور کرنے کے لیے سویا جاتا ہے، حق تعالیٰ ہر طرح کی تھکان سے منزہ اور سبحان ہیں، اللہ تعالیٰ کے سزاوار نہیں ہے کہ وہ سوئیں، آپ نے فرمایا کہ وہ میزان کو پست کرتا اور بلند کرتا ہے صبح کے اعمال شام ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچتے ہیں اور شام کے اعمال صبح ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچادیئے جاتے ہیں۔ اللہ تبارک تعالیٰ اور مخلوق کے درمیان میں نور کے حجابات ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا پردہ ہی نور ہے۔
"لَوْ کَشَفَهُ لَاَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهٖ کُلَّ شَیْئٍ اَدْرَکَهٗ بَصَرُهٗ"[1]

اگر اللہ تبارک وتعالیٰ اُس حجابِ نور کو اپنے سامنے سے ہٹادیں تو حق تعالیٰ کے چہرۂ انور کی تجلی سے اُن کے سامنے جو کچھ ہے وہ سب جل کر بھسم ہو جائے گا۔

اوراللہ تعالیٰ کے سامنے کیا چیز نہیں ہے؟ ایسا تھوڑا ہی ہے کہ کچھ چیزیں اللہ تعالیٰ کے سامنے ہیں کچھ چیزیں اللہ تعالیٰ کے پیچھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے پیچھے کوئی چیز نہیں ہے، سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے سامنے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے سامنے سے حجابِ نور کو ہٹادیں تو تمام مخلوق جل کر بھسم ہو جائے گی کیونکہ سب مخلوق اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے۔

ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا:

---

[1] صحیح مسلم:۲۰۱۱۴۔

''هَلۡ يَنَامُ رَبُّکَ'' کیا آپ کے پروردگار سوتے بھی ہیں؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "سبحان اللہ" استغفار کرو! کیا اللہ کبھی سوتا بھی ہے!

موسیٰ علیہ السلام کی قوم بڑی عجیب وغریب تھی، ایسی ایسی باتیں کرتی تھی اور پوچھتی تھی جو اللہ کی شان میں بڑی بے ادبی اور گستاخی کی ہوتی تھیں اور وہ سمجھتے تھے کہ ہم پوچھ رہے ہیں ، اس میں گستاخی کی کیا بات ہے؟ وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ کون سی بات پوچھنے کی ہے اور کون سی بات نہ پوچھنے کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ! آپ کی قوم نے یہ بات پوچھی؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے پروردگار! آپ کی ذات پاک ہے، ان لوگوں نے یہ بدتمیزی کی ہے۔ فرمایا کہ اپنی قوم کو سمجھانے کے لیے ایک کام کریں۔ دو انتہائی نازک کانچ کے گلاس اپنے ہاتھ میں پکڑ لو اور جاگتے رہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نیند کا غلبہ ہونے لگا۔ جیسے ہی اونگھ آتی تو فوراً ہوشیار ہوتے کہ کہیں دونوں گلاس آپس میں ٹکرا نہ جائیں، مگر جب بالکل اخیر شب ہوئی، صبح سویرے سے کچھ پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اچھی خاصی اونگھ آگئی۔ جیسے ہی اونگھ آئی تو دونوں گلاس ٹکرا گئے اور ٹوٹ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی اور فرمایا کہ اپنی قوم کو اس مثال سے سمجھا دو کہ اگر اللہ کو اونگھ آئے تو آسمان اور زمین اسی طرح برباد ہو جائیں گے۔ [1]

پوری کائنات کا نظام اللہ تبارک وتعالیٰ کے قائم رکھنے سے ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کو اونگھ بھی آگئی تو آسمان وزمین کا نظام جو کروڑہا کروڑ اور پتہ نہیں کتنے سالوں سے اللہ تعالیٰ نے یہ نظام قائم کر رکھا ہے، وہ پورا درہم برہم ہو جائے گا۔

---

[1]: تفسیر ابن کثیر: ۱ / ۵۱۸

یہاں ''لاتأخذہ'' کے معنی مفسرین نے "غالب" کے لکھے ہیں کہ نہ تو اُس پر اونگھ غالب آتی ہے جو چھوٹی چیز ہے اور نہ نیند غالب آتی ہے جو اُس سے بھی بڑی چیز ہے۔ اب مفہوم زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ ''لَاتَأْخُذُہٗ'' اُس پر غلبہ نہیں پا سکتی اونگھ اور نہ اس پر نیند غلبہ پا سکتی ہے۔ اونگھ اور نیند اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے بھی پہلے سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اونگھ اور نیند کو اپنی مخلوق کی مقہوریت بتانے کے لیے پیدا کیا ہے کہ تم کس طرح ہمارے قابو میں ہو کہ تمہارا خود اپنے اوپر کنٹرول نہیں ہے۔

صاحبِ مواہب الرحمن نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا بھی عجیب معاملہ ہے جو مخلوق کے فائدے کی چیز ہے وہ بھی مخلوق کے لیے عیب ہے۔ تب ہی تو اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں میں اس سے سبحان ہوں، اللہ تعالیٰ کو نہ نیند آتی ہے اور نہ اونگھ آتی ہے، اور مخلوق اسی کی محتاج ہے "سونا" احتیاج کو بتا رہا ہے۔ آدمی ضرورتمند ہے تو سوئے گا، جس کو کسی چیز کی ضرورت پڑ جائے تو پھر وہ کامل نہیں ہوا۔ جس کو کسی قسم کی محتاجی ہو، پھر وہ ناقص ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی وہ واحد ذات ہے جس کو کسی قسم کی محتاجی نہیں ہے۔ وہ صمد ہیں، وہ بے نیاز ہیں، وہ مستغنی ہیں اُن کو کسی چیز کی حاجت نہیں ہے۔

نیند موت ہی کی ایک کیفیت ہے

اللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِي قَضَى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرَى إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى [1]

---

[1] الزمر: ۴۲۔

اللہ ہی قبض کرتا ہے ان جانوں کو ان کی موت کے وقت اور ان جانوں کو بھی جن کو موت نہیں آئی ان کے سونے کے وقت، پھر ان جانوں کو تو روک لیتا ہے جن پر موت کا حکم فرما چکا اور باقی جانوں کو ایک میعاد معین تک کے لئے آزاد کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے پاس جس کے لیے موت کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے تو اُس کو کہا جاتا ہے کہ اب تمہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے، تم ہمارے پاس ہی رہو اور جس کو اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے پاس روکنا نہیں چاہتے اُس کو تھوڑے دن کے واسطے چھوڑتے ہیں۔

''اَلنَّوْمُ اَخُ الْمَوْتِ''[۱] نیند موت کا بھائی ہے۔ سونے کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے اُٹھنے کی دُعا سکھائی:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ أَحْیَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَ إِلَیْہِ النُّشُوْرُ [۲]

اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے ہمیں زندہ کیا مار دینے کے بعد اور اسی کی طرف دوبارہ جمع ہونا ہے۔

نیند موت ہی کی ایک کیفیت ہے، جس کے دوران ہمیں اپنے اوپر کوئی قبضہ اور کنٹرول نہیں ہوتا ہے۔ نیند عقل پر غالب آگئی، آنکھوں پر غالب آگئی، دل پر غالب آگئی صرف جسم کا روح سے تعلق منقطع ہو جانا باقی رہ جاتا ہے۔ اس لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے بندوں کی مقہوریت اور مجبوریت بتانے کے لیے نیند اور اونگھ کو پیدا فرمایا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اس سے سبحان ہیں۔ تمام مخلوق کو اللہ تعالیٰ قائم کیے ہوئے ہیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ اس سے نہ تھکتے ہیں اور نہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے نزدیک تھکان جیسی کوئی چیز پھٹکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ازل سے یعنی ہمیشہ سے ہیں اور کبھی بھی اُن پر تھکان طاری نہیں ہوئی۔

۱: البعث والنشور للبیہقی: ۴۲۴۔ ۲: صحیح البخاری: ۶۳۱۲۔

آسمان وزمین کی تمام چیزوں کا مالک

لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ

اُسی کی ہیں وہ ساری چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور ساری چیزیں جو زمین میں ہیں، جتنی بھی چیزیں آسمانوں میں ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی ہیں اور جتنی بھی چیزیں زمین میں ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ وہ اُن کے مالک ہیں اور وہی اُن کے خالق ہیں۔

تمام چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور تمام چیزیں جو زمین میں ہیں سب اُنہی کی ہیں۔ وہ ایسی عظمت والے ہیں کہ کوئی بھی اُن کے سامنے بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ

ان کی عظمت اور کبریائی کا عالم یہ ہے کہ کون ہے جو اُن کے پاس سفارش کرے، کون ہے جو اللہ کے سامنے یہ کہہ سکے کہ اس پر رحم کر دیجیے اور اس کو عذاب دیجیے، ایسا کہنے کی کسی کو بھی ہمت نہیں ہے۔ سوائے اُس کی اجازت کے، سفارش اور شفاعت کا حق صرف اُسی کو ہو گا جس کو اللہ تعالیٰ کی اجازت ہو گی۔

حق تعالیٰ اور نظام سفارش

حق تعالیٰ شانہ، کے پاس سفارش و شفاعت کا نظام دنیا کی طرح کا نہیں ہے۔ دنیا میں کسی آدمی کی شفاعت کی وجہ اُس کے قابلِ ترحم ہونے کو ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ یہ شخص قابلِ رحم ہے، آپ کے علم میں نہیں ہے، لہٰذا میں آپ کے علم میں لا رہا ہوں، برائے مہربانی آپ اس پر رحم فرما دیجیے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بتلانے والا کون ہے کہ یہ قابلِ رحم ہے یا نہیں؟ یا اس کو بخشنا ہے یا نہیں بخشنا؟ حق تعالیٰ کا علم تو محیط ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ شانہ، نے اس میں دو باتیں بیان

فرمائی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ کسی کی بھی یہ جرأت نہیں ہے کوئی ہم سے کچھ کہہ سکے، ہم اتنے عالیشان ہیں۔ اس سے مشرکین کا وہم دُور ہو گیا:

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى [1]

ہم ان کی پرستش صرف اسلئے کرتے ہیں کہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں۔

اور یوں کہا کرتے تھے:

هٰٓؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ [2]

ہم جن کی عبادت کرتے ہیں وہ اس وجہ سے نہیں کرتے کہ وہ اللہ کے برابر ہیں، بلکہ محض اس وجہ سے کرتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں کہ ہم تو براہِ راست اللہ کو راضی نہیں کر سکتے، ہم گنہگار ہیں اور اللہ کا دربار بہت عالی ہے۔ اب ہم گندوں کے لیے یہ طریقہ ہے کہ اگر ہم ان سے تعلق رکھیں گے اور اللہ ہم سے ناراض ہوں تو یہ لوگ اللہ سے کہہ کر ہمارے لیے راضی کر لیں گے۔ حق تعالیٰ نے اس کا جواب دیا ہے کہ یہاں پر کسی کی بھی نہیں چلتی۔

مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ إِلَّا بِإِذْنِهٖ

کون ہے جو ہمارے سامنے سفارش کی جرأت کرے۔

شفاعت کا مقصد

یہاں پر ایک بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے سفارش ہو گی اور اللہ تعالیٰ اجازت اُسی کے لیے دیں گے جس کو بخشوانا چاہیں گے۔ جب اللہ تبارک و تعالیٰ کسی کو بخشنا چاہتے ہیں تو پھر

۱: الزمر:۳۔ ۲: یونس:۱۸۔

کسی کی سفارش کی کیا ضرورت ہے؟ دراصل وہاں پر اللہ تعالیٰ صاحبِ شَفاعت کا مقام اور تقرب بتانے کے لیے سفارش کرنے کی اجازت دیں گے۔

حضور ﷺ کو شفاعتِ کبریٰ کا مقام دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ خود ہی حساب لینے والے ہیں، قیامت کے دن کئی سال گزر جائیں گے اللہ تعالیٰ حساب لینا شروع نہیں کریں گے، اللہ تعالیٰ کو ایسا جلال آئے گا کہ نہ اس سے پہلے ایسا جلال ظاہر کیا ہوگا اور نہ آئندہ، ایسا جلال ظاہر کریں گے۔ کسی کی بھی جرأت نہیں ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ سے یہ کہے کہ اے پروردگار! مخلوق پریشان ہے، آپ حساب لینا شروع کردیں۔ آدم علیہ السلام کہیں گے کہ مجھ سے بھول ہوگئی تھی، اگر اللہ تعالیٰ نے آج اس پر پکڑ لیا تو کیا ہوگا۔ ابراہیم علیہ السلام کہیں گے کہ میں نے تین باتیں کہہ دی تھیں، اگر اللہ تعالیٰ نے آج اس پر پکڑ لیا تو کیا ہوگا، سب سے اخیر میں حضور ﷺ اللہ پاک سے سفارش کریں گے۔ [1]

یہ سفارش آپ کے مقام کو بتلانے کے لیۓ ہوگی اور یہ شفاعت شفاعت کبریٰ کہلاتی ہے، ایسے ہی اللہ پاک اس کے بعد انبیاء، ملائکہ، صدیقین، شہداء اور صالحین کو شفاعت کی اجازت دیں گے [2] تو یہ اجازت اللہ پاک سے قرب اور ان کے مقام کو بتلانے کے لیۓ ہوگی، اسی طرح شہید ہیں، ان لوگوں کو جو شفاعت کا موقع دیا جائے گا، یہ بھی اللہ کے پاس اُن کا مقام بتانے کے لیے ہے کہ لوگ تو ان کو کوئی مقام نہیں دیتے تھے لیکن ہمارے پاس یہ اتنے محترم ہیں کہ ان کے کہنے کی وجہ سے ہم ایسے لوگوں کو بھی بخش دیں گے جن کے بارے میں جہنم کا فیصلہ کیا جاچکا ہے۔ حافظِ قرآن کو اپنے عمل کی وجہ سے جنت کا مستحق قرار دے دیا جائے گا کہ اس نے قرآن پڑھا اور اس پر عمل بھی کیا، اس کے بعد اُس کے خاندان کے ایسے

---

[1]: صحیح بخاری: ۴۷۱۲۔ [2]: مستدرکِ حاکم: ۸۷۷۲ والجامع لاحکام القران: ۱۹ / ۸۸۔

دس لوگوں کو جن کے لیے حساب کتاب کے بعد جہنم کا فیصلہ ہو چکا ہو گا، حافظِ قرآن سے کہا جائے گا کہ تم ان میں سے دس افراد کو چن لو، ہم اُنہیں جنت میں بھیج دیں گے[۱]۔ یہی حال عالم کا ہو گا۔ [۲] یہی حال حاجی کا ہو گا کہ وہ اپنے خاندان والوں کی سفارش کرے گا[۳]، ان سب لوگوں کا مقام بتایا جائے گا کہ یہ لوگ ہمارے نزدیک اتنے محترم ہیں کہ ہم ان کی خاطر اتنے افراد کو محفوظ کرلیں گے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ صاحبِ شفاعت کا مرتبہ بتانے کے لیے اُن لوگوں کو شفاعت کی اجازت دیں گے۔ بقیہ اللہ تعالیٰ کا دربار اتنا عالی ہے کہ اُن کے سامنے کوئی بھی کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

نصوص میں رائے زنی عظمتِ باری سے ناواقفیت کا نتیجہ

مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ''مَنۡ ذَا الَّذِي يَشۡفَعُ عِنۡدَهٗ ''کون ہے جو اُس کے پاس سفارش کر سکے، اِلّا یہ کہ اُس کی اجازت ہو، یہ اسی لیے فرمایا ہے کہ مخلوق اس کی بارگاہ میں جرأت نہ کرے۔ اصل میں دنیا میں اللہ تعالیٰ کسی کو پکڑتے نہیں ہیں اسی لئے جس کے جی میں جو آیا وہ کہتے ہیں۔ ایک آدمی دوسرے آدمی کے خلاف اتنا نہیں کہتا ہے جتنا اللہ تعالیٰ کے خلاف کہہ دیتا ہے۔ کچھ لوگ اپنی حکومتِ وقت کے خلاف اتنا نہیں بول پاتے جتنی جرأت اللہ تعالیٰ کے خلاف کرتے ہیں، کیونکہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا نہیں ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے خلاف کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے کلام کے خلاف کہتے ہیں، اللہ کے نبی کے خلاف کہتے ہیں، حالانکہ جو اللہ تعالیٰ کی عظمت ہے وہی اللہ تعالیٰ کے کلام کی عظمت ہے۔

اس لیے جو صحیح عارفین گزرے ہیں وہ قرآن وحدیث کی باتوں کے سامنے بالکل بھی بے ادبی نہیں کرتے اور نہ کچھ بولنے کی جسارت کرتے تھے۔ بے ادبی کرنا، گستاخی کرنا، اپنے کو

۱: سنن ترمذی: ۲۹۰۵۔ ۲: معجم طبرانی: ۸۰۵۹۔ ۳: مصنف عبد الرزاق: ۸۸۰۷

آزاد سمجھ کر جو چاہے اُس میں رائے زنی کر ڈالنا، قرآن پاک کے مطلب کو اپنی طرف سے بتا ڈالنا، یہ اللہ تعالیٰ کی بات ہے، اگر اس کا مطلب بگاڑ دیا اور اللہ تعالیٰ نے پوچھ لیا تو پھر آدمی کیا جواب دے گا؟ اللہ کے نبی کی بات کو توڑ مروڑ دیا، کل میدانِ محشر میں فیصلہ ہو گا کہ ہم نے اپنے نبی کو اپنا نمائندہ بنایا، ایسے بڑی قدرت والے اللہ نے جس کو اپنا نمائندہ بنایا ہو کیا اُس کی بات کھیل کود ہے؟ جس نے جو چاہا مطلب بتا دیا اور جس نے جو چاہا اُس کی تعبیر کر دی اور جس نے جیسا چاہا اُس کو رَد کر دیا، جس نے جیسا چاہا اُس کو قبول کر لیا، یہ سارے کھیل تماشے آخرت میں کھل جائیں گے، جب حق تعالیٰ شانہ، اپنے جلال کے ساتھ جلوہ افروز ہوں گے۔

جلالِ خداوندی

آسمان سے فرشتے لائن بنا کر اُتریں گے:

وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا [۱]

پروردگار آجائیں گے اور فرشتے صف در صف کھڑے ہو جائیں گے۔ اور اُس دن اللہ تبارک وتعالیٰ کا جلال اتنا ہو گا کہ آٹھ فرشتے عرش کو تھامنے کے لیے آجائیں گے [۲] حالانکہ اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھے ہوئے نہیں ہیں لیکن عرش پر اتنا بوجھ پڑ جائے گا کہ چار فرشتے اس کو برداشت نہیں کر سکیں گے۔ عرش کے مقابلے میں کرسی اور اس کو تھامنے والے فرشتے بالکل معمولی ہیں۔ کرسی کو تھامے ہوئے فرشتوں اور عرش کو تھامے ہوئے فرشتوں کے درمیان ستر پردے ہیں، ستر پردے نور کے اور ستر پردے ظلمت کے ہیں اور ہر پردہ کی موٹائی پانچ سو سال کی مسافت کے بقدر ہے اگر وہ پردے ہٹ جائیں تو عرش کے تھامے ہوئے فرشتوں کی نورانیت سے کرسی کو تھامے ہوئے فرشتے جل جائیں گے۔ [۳]

۱: الفجر: ۲۲۔ ۲: الحاقۃ: ۱۷۔ ۳: تفسیر مظہری: ۱/ ۳۵۹۔

وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ [1]

تمہارے پروردگار کے عرش کو اُس دن آٹھ فرشتے تھام لیں گے۔

اُس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ جب جلال کے ساتھ ہوں گے تو دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں متکبروں اور مغرورین کو اُس دن ایسا بے حیثیت کیا جائے گا جیسے چیونٹیاں وغیرہ پیروں میں روندی جاتی ہیں، کہ ان کو چیونٹیوں کی شکل میں بنادیا جائیگا کہ ہر چھوٹی چیز بھی ان سے اونچی ہو گی۔ [2] جو ایمان والے ہوں گے اُن کی عزت کی جائے گی چاہے وہ بادشاہ ہوں چاہے وہ فقیر ہوں، اُن کو بے عزت نہیں کیا جائے گا لیکن جو بے ایمان ہوں گے اللہ تعالیٰ کے سامنے اُن کی بادشاہت اور مقام کو بتانے کے واسطے یہ سب کچھ اُن کے ساتھ کیا جائے گا۔

انبیاءِ کرام پر جلالِ خداوندی کا اثر

اُس دن کا تصور قائم کیجئے کہ انبیاء بھی حوصلہ نہیں کرپائیں گے حالانکہ انبیاء بخشے بخشائے ہیں، نبی معصوم ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے محبوب ہوتے ہیں، جو کچھ اُن سے ہوا وہ اُس غلطی میں شمار نہیں ہوتا جو انسانوں کی عام غلطیاں ہوتی ہیں، پھر بھی صرف اللہ کے جلال، عظمت اور خوف کی وجہ سے اُس دن ایک ایک بات کے بارے میں بھی نبی ڈر رہے ہوں گے کہ اگر آج اللہ پوچھ لیں تو کہنے کا کچھ حوصلہ نہیں ہے۔ آدم علیہ السلام کہیں گے کہ ٹھیک ہے مجھے معاف کردیا گیا ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ آپ سفارش کرنے آئے ہیں، آپ نے تو جنت کا پھل کھایا تھا۔ میں یہ حوصلہ نہیں کرسکتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کہیں گے کہ میں حوصلہ نہیں کرسکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کہیں گے کہ میں حوصلہ نہیں کرسکتا حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں نبوت کو جاری کیا گیا، ان کو اتنا بڑا مرتبہ عطا فرمایا:

---

[1]: الحاقة:۱۷ - [2]: سنن ترمذی:۲۴۹۲

وَاتَّخَذَ اللّٰهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا [1]

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو خلیل بنایا۔

مگر ابراہیم خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بھی حوصلہ نہیں ہو گا کہ وہ کچھ بولیں۔ جب سرکار دو عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے سوا دیگر نبیوں کو کچھ بولنے کا حوصلہ نہیں ہو گا تو پھر غیر نبی کے کیا کہنے۔ اس سے اندازہ لگائیں اُس دن پوری انسانیت جمع ہو گی اور یکدم سناٹا چھایا ہوا ہو گا۔ پوری انسانیت حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک جتنے لوگ آئے ہوں گے، سب جمع ہوں گے یہ کتنے ہوں گے؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ میری پوری اُمت دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے پورے اونٹ میں ایک تِل۔[2] حق تعالیٰ شانہ، نے ارشاد فرمایا:

"اتَّقُوا رَبَّكُمْ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ" [3]

اپنے رب سے ڈرو یقیناً قیامت کا زلزلہ بہت بھاری ہو گا۔

"ساعۃ" کا بھاری پن

حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ جانتے ہو اُس دن بھاری پن کیا ہو گا؟ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا کہ اللہ اور اُس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جلال میں ہوں گے اور یہاں سے وہاں تک سناٹا ہو گا اور حق تعالیٰ شانہ، فرمادیں گے کہ جہنمیوں کو جہنم رسید کر دو۔ فرشتے کہیں گے کہ اے پروردگارِ عالم! اس کا کیا مفہوم ہے؟ حق تعالیٰ شانہ، فرمائیں گے کہ ایک ہزار میں سے نو سو ننانوے کو جہنم میں ڈال دو۔ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ وہ ایسا دن ہو گا کہ۔

۱: النساء:۱۲۵۔ ۲: مستدرک حاکم:۸۷۔ ۳: الحج: ۱۔

یَوۡمًا یَّجۡعَلُ الۡوِلۡدَانَ شِیۡبَا[۱]

(جو بچوں کو بوڑھا بنادے گا) بچے بھی بوڑھے ہو جائیں گے۔

حق تعالیٰ شانہ، یہ اعلان فرمادیں گے کہ جتنے بھی لوگ ہیں فی ہزار نو سو ننانوے کو جہنم میں ڈال دو۔ حضور اکرم ﷺ نے دیکھا کہ صحابہ سہم گئے اور اُن کے چہرے یکدم مرجھا گئے اور سمجھ گئے کہ اب ہمارے بس کی بات نہیں یعنی بچنا مشکل ہے۔ فرمایا کہ تم بے فکر رہو، حق تعالیٰ شانہ، نے اس کے مکافات میں یاجوج ماجوج کو پیدا کیا ہے اور ایک نبی سے دوسرے نبی کے درمیان جتنے کافر اور سرکش لوگ آئے ہیں یہ سب ان میں شمار کیے جائیں گے اور تم کو اس میں سے بچالیا جائے گا، نو سو ننانوے دوسروں میں سے ہوں گے اور ایک تم میں سے ہو گا یعنی میری اُمت میں سے ہو گا، اس لیے دوسری اُمتوں میں سے بہت کم لوگ جنت میں جانے والے ہیں۔[۲] تب کہیں جاکر صحابہ کی جان میں جان آئی ورنہ حضور ﷺ کے فرمانے پر سب گھبرا گئے تھے۔

روایت میں تو یہاں تک آیا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ، فرشتوں کے ذریعے سے مسلمانوں کے ہاتھوں میں ایک ایک یہودی یا عیسائی کو دیں گے کہ یہ تیرا بدلہ ہے، اپنے بدلے جہنم میں اس کو ڈال دے۔[۳]

اہلِ جنت کی صفیں

جنت میں جانے والوں کی ایک سو بیس صفیں ہوں گی۔ صف سے مراد مسجد کی صف نہیں ہے بلکہ پوری زمین کی صف ہے۔ زمین آٹے کے پیڑے کی مثل ہے جیسے روٹی بنانے سے پہلے

۱: المزمل:۱۷۔ ۲: مستدرکِ حاکم:۷۸۔ ۳: مسند احمد:۱۹۴۸۱۔

پیڑا ہوتا ہے زمین بھی اسی طرح کی ہے۔ اس دن زمین کو ایک دم پھیلا دیا جائے گا۔ اسی پر حشر قائم ہونے والا ہے۔ پھر یہاں سے لوگ جہنم کے اوپر پل صراط پر چڑھیں گے، اُس کے بعد جنت آئے گی۔ حشر زمین پر ہی قائم ہو گا۔ لوگ زمین ہی سے اُٹھنے والے ہیں اور دھیرے دھیرے میدانِ عرفات میں جمع ہونا شروع ہو جائیں گے۔ انسان پھیلتے پھیلتے پوری زمین پر پھیل جائیں گے اور آدمی کو پوری زمین پر صرف اپنے ہی کھڑے ہونے کی جگہ ملے گی۔ اس پر جنتیوں کی ایک سو بیس صفیں بنائیں جائیں گی جس میں سے اسّی صفیں اُمت محمدیہ کی ہوں گی۔ حضور ﷺ نے تسلی دی اور فرمایا کہ تم بے فکر رہو۔ [۱]

صحابہ کو یہاں تک فرمادیا کہ میری اُمت کے ستر ہزار لوگ ایسے ہوں گے جن سے اللہ تعالیٰ حساب بھی نہیں لیں گے اور جنت میں پہنچادیں گے۔ اُن ستر ہزار میں سے ہر ایک کے ساتھ مزید ستر ہزار کو جنت میں داخل کیا جائے گا۔ [۲]

اُمتِ محمدیہ کی خصوصیت

ایک روایت میں یہ بھی فرمایا کہ صرف میری اُمت کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ پوری کی پوری جنت میں جائے گی۔ اس سے پہلے جتنی اُمتیں آئی ہیں اُن میں سے کچھ جنت میں جائیں گی اور کچھ جہنم میں اور میری اُمت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ پوری کی پوری جنت میں جائے گی سوائے مشرک کے۔ [۳]

اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کو اپنے گناہوں کی سزا بھگتنا بھی پڑے تو اس کے بعد اُس کو بھی جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر ذرّہ برابر بھی ایمان ہے تو وہ جنت میں جائے گا۔ حضور ﷺ کی برکت سے ایسا ہونے والا ہے چاہے جتنی بھی سزا بھگتنا پڑے ہزاروں،

۱: المعجم الکبیر:۱۶۳۵۶۔ ۲: سنن الترمذی:۲۶۲۴۔ ۳: مسندِ احمد:۲۷۴۲۔

لاکھوں، کروڑوں سال جہنم میں جلنا پڑے مگر حضور ﷺ کی برکت سے اُسے ایمان کا فائدہ یہ ملے گا کہ اُسے جہنم سے نکالا جائے گا اور سب کے سب جو مسلمان مرے ہیں اور حضور ﷺ کی اُمت میں سے ہیں جنت میں پہنچادیئے جائیں گے۔ اگرچہ اوّل مرحلے میں جانے والوں کی تعداد دوسروں کے مقابلے میں کم ہو گی۔

توازن قائم رکھنے کے لیے حضور ﷺ نے جو ارشادات فرمائے، وہ بھی آپ لوگوں کو سنادیے گئے اور یہ اس مضمون کو مستحضر کرنے کے لیے عرض کیا گیا کہ حق تعالیٰ جل جلالہ، نے آیۃ الکرسی کے ذریعے سے انسانیت پر اپنا اثر بتلایا اور اپنا تعارف کروایا ہے کہ میں کیسا ہوں، اسی لیے اس آیت کو اہم ترین آیت قرار دیا گیا ہے۔ اور اس مضمون کے ذیل میں چند باتیں اسی سے متعلق آپ کے سامنے ضمناً بیان کی گئیں۔

باری تعالیٰ کا علمِ محیط

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ

جانتا ہے وہ اُن کے تمام حاضر و غائب حالات کو۔

دنیا میں مخلوق کے سامنے جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ اُس کو جانتے ہیں اور غائب سے مراد آخرت ہے۔ دنیا میں مخلوق کے کیا کیا حالات ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے واقف ہیں اور آخرت میں مخلوق کے ساتھ کیا حالات آنے والے ہیں، ہر ہر مخلوق کے ساتھ کیا کچھ ہونے والا ہے، اللہ تعالیٰ سب جانتے ہیں۔

بعضوں نے لکھا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ جانتا ہے لوگوں کے مقامات کو بھی کہ ان کو کون سا مقام ملنے والا ہے؟ اور لوگوں کے حالات کو بھی وہ جانتا ہے۔ لوگوں کے اقوال کو

بھی جانتا ہے اور لوگوں کے اعمال کو بھی جانتا ہے۔ آئندہ جو عمل کرنے والے ہیں اُن کو بھی جانتا ہے اور جو نیک یا بُرا عمل کر کے کما لیا ہے اُس کو بھی جانتا ہے۔ وہ سب کو جانتا ہے۔

وہ جانتے ہیں اُن تمام چیزوں کو جو مخلوق کے سامنے ہیں اور اُن تمام چیزوں کو جو مخلوق کے پیچھے ہیں۔

خالق و مخلوق کے علم میں کوئی جوڑ نہیں

اللہ تعالیٰ کے علم میں مخلوق کسی بھی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتی سوائے اُس چیز کے جس کو اللہ تبارک و تعالیٰ بتا دیں۔ اللہ تعالیٰ نے جتنا بتا دیا ہے مخلوق اُتنا ہی جان سکتی ہے اور اس کے علاوہ کسی مخلوق کو کچھ علم نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے الگ الگ درجے بنائے ہیں، کسی مخلوق کو تھوڑا بتایا ہے اور کسی مخلوق کو زیادہ بتایا ہے۔ کسی مخلوق کو اور زیادہ بتایا ہے مگر جس کو بھی جو کچھ بتایا اُس کا علم اللہ کے علم سے کوئی جوڑ نہیں کھاتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر جب سفر فرما رہے تھے تو ایک چڑیا آکر کشتی کے کنارہ بیٹھ گئی اور اپنی چونچ ڈبوئی تو حضرت خضر علیہ علیہ السلام نے فرمایا میرا علم اور تمہارا علم اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں اتنا بھی نہیں ہے جتنا اس چڑیا نے سمندر میں سے کم کیا ہے۔ [1]

یہ بھی محض تمثیلاً ہے۔

حضور ﷺ کے علم اور دیگر مخلوقات کے علم میں کوئی تناسب نہیں

مخلوقات میں سب سے اشرف مخلوق سرکارِ دو عالَم ﷺ ہیں۔ حضور ﷺ نے اپنے بارے میں فرمایا:

---

[1]: صحیح بخاری: ۱۲۲۔

''أورَثَنِی عِلمَ الأوَّلینَ وَالْآخِرِینَ''[۱]

اللہ تعالیٰ نے مجھے اوّلین اور آخرین کا علم دیا۔

تمام پچھلے لوگوں کا علم آپ ﷺ کو دیا گیا اور تمام اگلوں کا علم آپ ﷺ کو دیا گیا۔ آپ ﷺ کو مَلَکُوْتُ السَّمٰوٰاتِ وَالْأرْضِ۔ آسمان اور زمین کی بادشاہتیں اور وہاں کے علوم آپ ﷺ پر کھول دیے گئے اور مخلوق میں سب سے زیادہ علم آپ ﷺ کو دیا گیا مگر آپ ﷺ کا علم اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں کچھ شمار میں نہیں آتا۔ اسی وجہ سے حضور پاک ﷺ سب سے زیادہ سجدے کرتے تھے، سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشانی ٹیکتے تھے۔ مخلوق نے جتنی عبادت کی اُس سے کہیں زیادہ عبادت حضور ﷺ نے کی۔ مخلوق نے جتنا اللہ تعالیٰ کو پہچانا اُس سے کہیں زیادہ حضور ﷺ نے پہچانا۔ مخلوق جتنی اللہ تعالیٰ سے ڈرتی تھی اُس سے کہیں زیادہ حضور ﷺ ڈرتے تھے کیونکہ جو جتنا اللہ تعالیٰ کو پہچانے گا وہ اتنا ہی ڈرے گا۔ حضور ﷺ نے سب سے زیادہ پہچانا اس لیے وہ سب سے زیادہ ڈرنے والے تھے۔

''أنَا أَتْقَاكُمْ للهِ تَعَالٰی وَأشَدُّکُمْ خَشْیَۃً''[۲]

میں تم میں سب سے زیادہ متقی ہوں، اللہ سے ڈرنے میں سب سے زیادہ تقویٰ مجھے ہے اور سب سے زیادہ خوف مجھے ہے۔ اس واسطے کہ جتنا حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کو پہچانتے ہیں اُتنا کوئی نہیں پہچانتا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا علم ایسا ہے کہ جس مخلوق کو دیا گیا وہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے مقابلے میں کم ہے اور جس کو علم دیا گیا وہ اُس کے اعتبار سے بہت زیادہ ہے۔ حضور ﷺ کے علم کے

---

[۱]: روح المعانی:۸ / ۳۴۴۔ [۲]: صحیح مسلم:۱۱۰۸۔

مقابلے میں کسی بھی مخلوق کے علم کا کوئی تناسب نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو اتنا زیادہ علم دیا۔

اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو اتنا علم دیا کہ لوگوں کو شبہ ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو اتنا علم دے دیا جتنا اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو جو علم دیا ہے وہ دوسروں کے مقابلے میں اتنا زیادہ ہے کہ اس کا کسی کے ساتھ تقابل نہیں کیا جاسکتا۔ حضور ﷺ کا علم مخلوق کے اعتبار سے اتنا زیادہ ہے لیکن حق تعالیٰ شانہ، کے علم کے مقابلے میں وہ کچھ شمار نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا علم بالکل الگ ہے۔

وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ

مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی معلومات میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں۔

اللہ تعالیٰ کو سب کا احاطہ ہے مگر مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی کسی بھی چیز کا احاطہ نہیں، مگر وہی جو اُس نے چاہا۔ اللہ تعالیٰ نے جتنا چاہا بس اُتنا مخلوق کو بتا دیا۔

کنہِ باری عقلِ انسانی سے بالاتر

بعض لوگوں نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات ہے کہ مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا احاطہ نہیں ہے اور مخلوق اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا احاطہ کر ہی نہیں سکتی۔ خدا کی حقیقت کو مخلوق جانے، یہ مخلوق کے بس میں نہیں ہے۔ حتیٰ کہ علماء اس پر متفق ہیں کہ آخرت میں جب اللہ تعالیٰ کا دیدار ہو گا، کسی بھی مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی حقیقت سمجھ میں نہیں آئے گی کہ اللہ تعالیٰ کی حقیقت کیا ہے۔؟ نہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی حقیقت سمجھ میں آئے گی اور نہ اللہ کی صفات کی حقیقت سمجھ میں آئے گی۔ مخلوق کی عقل میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی کنہ کو جان لے۔

اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں غور مت کرو[۱]۔ یہ تمہاری عقل کا میدان نہیں ہے کہ تم عقل کا گھوڑا اُس میں دوڑا سکو۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تو ہے ہی، مخلوق اللہ تعالیٰ کی صفت کو بھی نہیں جان سکتی (حقیقتاً)۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اوّل ہیں۔ ہم بعد میں آئے ہیں لہٰذا ہمیں نہیں معلوم کہ پہلے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم نہیں تھے، ہمیں پیدا کیا گیا، ہمیں نہیں معلوم کہ اوّل کیا ہوتا ہے۔ ہر پیدا ہونے والی مخلوق حادث ہے، کسی نہ کسی وقت میں اُس کے لیے فناء ہے۔ سب کے بعد اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ کسی مخلوق کے ساتھ بھی آخر تک کا معاملہ نہیں ہے، لہٰذا کوئی بھی اس کو نہیں سمجھ سکتا۔ حق تعالیٰ کی نہ ذات کی کنہ جانی جاسکتی ہے اور نہ صفات کی کنہ۔ البتہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت میں غور کرنے سے حقیقت تو معلوم نہیں ہوتی لیکن عظمت، بڑائی اور قدرت کی وجہ سے آدمی کے قلب پر تأثر آتا ہے، اس کی وجہ سے آدمی بندگی اختیار کرتا ہے۔ فرمایا کہ تَفَكَّرُوْا فِيْ الْخَلْقِ وَلَا تَفَكَّرُوْا "فِيْ الخَالِقِ فَإِنَّكُمْ لَا تَقْدِرُوْنَ قَدْرَهٗ"[۲] اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات میں غور مت کرو بلکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں غور کرو، کیونکہ تم میں اس کے اندازے کی قدرت نہیں۔

وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ

اور مخلوق نہیں احاطہ کرسکتی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں سے کسی کا، مگر اُتنا ہی جتنا اللہ تعالیٰ ہی نے بتادیا اپنی ذات وصفات کے بارے میں کہ میں کیسا ہوں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ "مِنْ عِلْمِهِ" سے مراد معلومات ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی جو معلومات ہیں اُس کا کوئی بھی احاطہ نہیں کرسکتا مگر وہی جو اُس نے بتادیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم میں سے جس کو جتنا علم دے دیا بس اُس کو اتنا ہی معلوم ہوگا مگر اللہ تعالیٰ کو جتنا علم ہے اتنا کسی کو بھی

۱: المعجم الاوسط: ۶۳۱۹۔ ۲: کنز العمال: ۵۷۰۶

معلوم نہیں ہے۔ مخلوق میں اللہ تعالیٰ نے کسی کو کم، کسی کو زیادہ علم عطا کیا اور کسی کو بہت ہی زیادہ عطا کیا، مگر وہ مخلوق کے اعتبار سے بہت زیادہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے اعتبار سے اُس کا کوئی حساب نہیں ہے۔

قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا۔ [1]

آپ کہہ دیجئے کہ اگر سمندر روشنائی بن جائے میرے رب کی باتوں کو لکھنے کے لیئے تو میرے رب کی باتوں کے ختم ہونے سے پہلے ہی سمندر ختم ہو جائے گا، اگرچہ ہم اتنی ہی اور روشنائی لے آئیں۔

اور ایک جگہ پر ہے:

وَلَوْ أَنَّمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ

زمین پر جتنے درخت ہیں سب کو قلم بناؤ۔

وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ

پورے سمندر کو سیاہی اور مزید اُس میں سات سمندر ملاؤ۔

مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللهِ۔ [2]

اللہ کی بات ختم نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ کے علم کو کوئی نہیں گھیر سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی لامحدود ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات لامحدود ہے تو اللہ تعالیٰ کی صفات بھی لامحدود ہیں۔

۱: الکہف:۱۰۹۔ ۲: لقمان:۲۷۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو پوری مخلوق کو علم دیا ہے، وہ علم اللہ تعالیٰ کے سامنے ذرّہٴ بے مقدار ہے۔ محدود کا لامحدود کے ساتھ کوئی جوڑ ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات لامحدود ہے۔

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ

اللہ تعالیٰ کی کرسی آسمانوں اور زمینوں سے وسیع ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف کرسی کی نسبت

اللہ تعالیٰ کی طرف کرسی کی نسبت اس طرح سے ہے جیسے بیت اللہ کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت ہے۔ مکہ مکرمہ میں اللہ تعالیٰ کا جو گھر ہے ایسا تھوڑا ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس میں آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے شرافت کے طور پر ایک نسبت اس کی طرف کی ہے کہ یہ میرا گھر ہے۔ تم اس کا طواف کرو تو میرا ہی طواف شمار ہوگا، یہاں تم حج کرو تو میرا ہی حج شمار ہوگا۔ جیسے بیت اللہ، اللہ تعالیٰ کے رہنے کی جگہ نہیں لیکن اللہ تعالیٰ سے نسبت ہے، یہی حال کرسی کا ہے۔ یہ "کرسی" ہماری عقل و فہم سے سمجھی جانے والی کرسی سے الگ ہے۔ ہمارے ذہن میں کرسی کا مفہوم یہ ہے کہ جب آدمی آفس میں ہوتا ہے تو وہ بیٹھتا ہے، جس پر وہ بیٹھتا ہے وہ اُس کی کرسی ہے۔ آیۃ الکرسی میں یہ مفہوم نہیں ہے۔ "کرسی" مخلوق ہے اور مخلوق خالق کو گھیر ہی نہیں سکتی۔ جب آدمی کرسی پر بیٹھتا ہے تو کُرسی ظرف ہوگی اور بیٹھنے والا اُس کا مظروف ہو جائے گا، کرسی اپنے بیٹھنے والے آدمی کو گھیر لے گی۔ گویا مخلوق نے خالق کو گھیر لیا حالانکہ خالق نے سب کو گھیرا ہوا ہے، اُس کو کوئی نہیں گھیر سکتا، نہ اُس کو کرسی گھیر سکتی ہے اور نہ اُس کو عرش گھیر سکتا ہے۔ یہی حال عرش کا ہے۔ کُرسی کے اوپر عرش ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی کرسی کا حال یہ ہے کہ وہ آسمان و زمین کو گھیرے ہوئے ہے تو پھر عرش کا کیا حال

ہو گا؟ اُس کا تو کوئی حساب نہیں ہے۔ مگر وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا مسکن نہیں ہے کیونکہ عرش بھی مخلوق ہے اور مخلوق خالق کو نہیں گھیر سکتی۔ یہ اصل میں سمجھنے کی چیز ہے۔ ان چیزوں کو سمجھنے سے عقیدوں کے مسئلے بھی حل ہوتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نہ عرش پر بیٹھے ہوئے ہیں اور نہ کرسی پر۔

کرسی کی وسعت

ایک مرتبہ حضور ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! کرسی کیا ہے؟ آپ ﷺ نے اس کو سمجھانے کے لیے فرمایا کہ اگر زمین کو کھول دیا جائے، آسمان کو کھول دیا جائے، یکے بعد دیگرے ان سب کو ملایا جائے اور ساتوں آسمان اور زمین کا میدان بنایا جائے تو یہ ساتوں آسمان و زمین کرسی کے مقابلے میں ایسے ہیں جیسے بہت بڑے میدان میں ایک حلقہ (چھلّہ) ڈال دیا گیا ہو۔[1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہاں پر کرسی کا جو ذکر فرمایا ہے، وہ اللہ پاک کے دونوں قدموں کی جگہ میں ہے[2] (اور اس کی حقیقت اللہ ہی کو معلوم ہے)۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ آپ ﷺ تشریف فرما تھے۔ بادل آیا۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ جانتے ہو یہ کیا ہے؟ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا کہ اللہ و رسولہ اعلم۔

صحابہ سمجھ گئے کہ اس سوال کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم کہیں یہ بادل ہے، کیونکہ یہ بات سب ہی کو معلوم ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ممکن ہے کہ حضور ﷺ حقیقت کو پوچھ رہے ہوں اور کسی کو بھی کسی چیز کی حقیقت معلوم نہیں ہے۔

۱: تفسیر ابن کثیر: ۱ / ۳۱۰۔ ۲: المستدرک: ۳۱۱۶۔

انسان مخلوق کی حقیقت سے بے بہرہ

بادل کیا ہے؟"بادل" ایک نام ہے۔ آدمی کو پوری مخلوق کے نام معلوم ہوتے ہیں اور اس کے چند فائدے ہی معلوم ہوتے ہیں، اس کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی۔ بادل ہے، زمین ہے، آسمان ہے، چاند ہے، سورج و ستارے ہیں، یہ سب نام ہیں اور ان کی منفعت مخلوق کو معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت کسی کو بھی معلوم نہیں ہوتی کہ حقیقتاً یہ سب کیا ہیں؟ صحابہ نے سوچا کہ ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ حقیقت پوچھنا چاہتے ہوں اور ہمیں حقیقت معلوم ہی نہیں ہے۔ ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے وہ صرف نظر آنے کی حد تک ہے ورنہ اُس کی حقیقت کیا ہے، ہمیں معلوم نہیں ہے۔

آج کل جو سائنس اور مشاہدے کا زور ہے، اس میں کیا ہوتا ہے؟ آدمی وہ چیز دیکھتا ہے جو چیز اُس کو نظر آرہی ہے اور بس، ورنہ وہ چیز کیا ہے، اُس کو معلوم ہی نہیں ہوتا۔ آدمی مخلوق کی حقیقت بھی نہیں سمجھ سکتا۔

غرض یہ کہ حضور ﷺ نے فرمایا یہ بادل ہے۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس پر تم لوگ بیٹھے ہو وہ کیا ہے؟ عرض کیا کہ یہ زمین ہے۔ پھر اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ جانتے ہو ایک زمین سے دوسری زمین کا فاصلہ کتنا ہے؟ فرمایا کہ ایک زمین سے دوسری زمین کا فاصلہ پانچ سو سال کا ہے۔ [۱]

حضرت اُبی ابن کعب رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ سات سو سال کا فاصلہ ہے۔ [۲] پھر اُس زمین سے دوسری زمین کا فاصلہ سات سو سال کی مسافت کا ہے۔ یعنی آدمی سات سو

۱: در منثور:۱ / ٦٣۔ ۲: تفسیر السراج المنیر:۳ / ۱۷۸۔

سال چلے تب وہ دوسری زمین پر پہنچے۔ دوسری سے تیسری اور تیسری سے چوتھی اور چوتھی سے پانچویں زمین کا بھی یہی فاصلہ ہے۔

پھر پوچھا کہ جانتے ہو ساتویں زمین کے نیچے کیا ہے؟ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا کہ ہم نہیں جانتے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر ایک رسی چھوڑی جائے پہلی زمین سے پھر دوسری زمین سے پھر تیسری زمین سے پھر چوتھی زمین سے پھر ساتویں زمین کے بعد وہ رَسی سیدھی اللہ تعالیٰ کے پاس جائے گی۔ یہ اسرار ہیں جس پر اللہ تعالیٰ کھولیں اُسی کو یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ پھر فرمایا زمین سے آسمان کا فاصلہ کتنا ہے۔ فرمایا کہ پانچ سو سال کا فاصلہ ہے، اگر کوئی تیز رفتاری سے پانچ سو سال تک آسمان کی طرف جائے تو پانچ سو سال میں آسمان پر پہنچے گا۔ اور پہلا آسمان خود اتنا ضخیم (موٹا) ہے کہ اُس کو پار کرنے کے لیے بھی پانچ سو سال کی مسافت درکار ہے۔ پھر پہلے آسمان سے دوسرا آسمان بھی اتنا ہی بڑا ہے اور پھر دوسرے آسمان سے تیسرا آسمان بھی اتنا ہی بڑا ہے اور تیسرے سے چوتھا آسمان بھی اتنا ہی بڑا ہے، چوتھے آسمان سے پانچواں آسمان بھی اتنا ہی بڑا ہے، پانچویں سے چھٹا آسمان بھی اتنا ہی بڑا ہے اور چھٹے سے ساتواں آسمان بھی اتنا ہی بڑا ہے۔ [1]

۔ یہ تمام ساتوں آسمان اور ساتوں زمین کرسی کے مقابلے میں یہ حیثیت رکھتے ہیں جیسے ایک بڑے میدان میں چھلہ پڑا ہوا ہو۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کرسی کی فضیلت وحیثیت آسمان وزمین پر ایسی ہے جیسے میدان کی حیثیت اس چھلہ پر۔

---

[1]: سنن ترمذی: ۳۲۹۸۔

حاملانِ عرش وکرسی

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے کرسی کے بارے میں تفسیر مظہری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک اور روایت بیان فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے کرسی ایک ایسی مخلوق بنائی ہے جس کے چار پائے ہیں۔ ایک پایا ساتوں آسمانوں سے اوپر اور ساتوں زمینوں سے نیچے ہے۔ ایک پائے اور دوسرے پائے کے درمیان کی مسافت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا اور ان چاروں پایوں کو چار فرشتے اُٹھائے ہوئے ہیں۔[۱]

جب اللہ تعالیٰ قیامت قائم فرمائیں گے تو حاملانِ عرش اللہ تعالیٰ کے جلال اور عظمت کی وجہ سے عرش کا تحمل نہیں کرسکیں گے، حالانکہ عرش پر اللہ تعالیٰ نہیں ہوں گے لیکن اللہ تعالیٰ کے جلال کا وزن عرش پر اتنا پڑے گا کہ اُس دن یہ حاملانِ عرش چار سے آٹھ ہو جائیں گے۔[۲] ابھی صرف چار ہیں۔ حاملانِ عرش اور حاملانِ کرسی کے درمیان ستر حجاب تاریکی کے اور ستر حجاب نور کے ہیں۔ ایک حجاب کا فاصلہ پانچ سو برس کی مسافت کا ہے۔ اس سے اندازہ لگایئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو کرسی بنائی ہے وہ کتنی بڑی ہے اور حاملانِ کرسی وہ کتنے بڑے ہیں۔ پھر پوری کرسی اپنے حاملین سمیت عرش کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی "**لَا یَقْدِرُ قَدْرَہٗ اِلَّا اللہ**"، عرش کی مقدار اور اس کا اندازہ سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں کرسکتا۔ اگر حاملانِ عرش اور حاملانِ کرسی کے درمیان میں سے ستر تاریکی کے حجاب اور ستر نور کے حجاب ہٹا دیے جائیں تو حاملانِ عرش کی تجلی اور نور سے حاملانِ کرسی جل جائیں گے۔[۳]

تو عرش اتنا بڑا ہے کہ ساتوں آسمان اور ساتوں زمین کرسی کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہیں رکھتے اور کرسی عرش کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا عرش بنایا

۱: تفسیرِ مظہری: ۱ / ۲۶۸۔ ۲: الحاقۃ: ۱۷۔ ۳: تفسیر مظہری: ۱ / ۳۵۸۔

ہے۔ عرش پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت ہے، اللہ تعالیٰ کا جلال ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جائے کہ حق تعالیٰ شانہ، کتنے عظیم ہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے بتایا جاتا ہے کہ ایک انسان کے ذہن میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی جتنی عظمت آسکتی ہے اُس کے تصور کے حساب سے آئے ورنہ تو آدمی کسی بھی چیز کو جان ہی نہیں سکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ مخلوق کو پیدا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ کے وجود کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ اگر اللہ تعالیٰ زندگی نہ دیتے اور کہا جاتا کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہیں تو ان کے بارے میں معلوم ہی نہیں ہوتا۔ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں سننے کا خزانہ نہ دیتے اور ہمیں بتایا جاتا کہ اللہ تعالیٰ سنتے ہیں تو ہمیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ سننا کسے کہتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھنے کے لیے آنکھیں نہیں دیتے اور ہمیں بتایا جاتا کہ اللہ تعالیٰ دیکھتے ہیں تو ہمیں کیسے معلوم ہوتا کہ دیکھنا کیا ہوتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے اور ہمارے دیکھنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے، جس میں کوئی جوڑ نہیں، مگر سمجھنے کے لیے اور سہولت کے لئے اللہ پاک نے یہ چیزیں دی ہیں کہ دیکھنا ایسا ہوتا ہے، سننا ایسا ہوتا ہے، بولنا ایسا ہوتا ہے، زندگی ایسی ہوتی ہے، وجود ایسا ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ، نے اپنی عظمت اور کبریائی بتانے کے واسطے یہ مخلوقات بنائیں ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی، پھر بڑی سے بڑی اور بڑی سے بڑی بنائی۔

ہمیں دنیا میں دو سو یا چار سو گز کا ایک مکان بڑا معلوم ہوتا ہے۔ اگر اس کے مقابلے میں ہمیں کسی کا بڑا محل دکھادیا جائے تو وہ ہمیں بڑا معلوم ہوتا ہے۔ چھوٹی بستی کے مقابلے میں بڑی بستی بڑی معلوم ہوتی ہے اور بڑی بستی کے مقابلے میں مزید بڑی بستی بڑی معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک امریکا اتنا بڑا ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ اگر آپ امریکا کے ساتھ رُوس کو ملادیں، افریقہ کو بھی ملادیں، ایشیائی ملکوں کو بھی ملادیں، تمام ممالک کو آپس میں ملادیں تو وہ زمین کا تہائی بنے گا۔ زمین پر پانی اس سے زیادہ ہے اور پانی کے اوپر ہوا ہے، اور ہمیں اس ہوا کا

انداز ہ نہیں ہے اور اس ہوا کے اوپر ایک آگ کی لپیٹ ہے جس کا ہمیں انداز ہ نہیں ہے۔ (یہ سب مل کر کتنا ہے؟)

افلاک میں اللہ کی قدرت

آج کل اہلِ سائنس کہہ رہے ہیں کہ کروڑہا کروڑ سیارے پوری فضا میں پھر رہے ہیں۔ یہ لوگ اپنی رسد گاہوں اور بڑی بڑی دُور بینوں سے چالیس کروڑ سے زیادہ سیاروں کو دیکھ رہے ہیں، جس میں بیس کروڑ سیارے زمین کے مشابہ ہیں اور بیس کروڑ چاند کے مشابہ ہیں، ان کو جتنا سمجھ میں آرہا ہے یہ لوگ کہہ رہے ہیں۔ انہیں پوری خلاء میں چالیس کروڑ سیارے نظر آرہے ہیں اور یہ لوگ اس کا بھی اقرار کررہے ہیں کہ ایک سیارہ دوسرے سیارہ سے اتنا بڑا ہے جس کا کوئی جوڑ نہیں۔ جیسے سورج کے مقابلے میں زمین مٹر بلکہ چنے کے دانے برابر ہے۔ سورج کے علاوہ جو دوسرے سیارے نظر آرہے ہیں اُن کے مقابلے میں سورج چنے کے دانے کے برابر ہے۔ پھر یہ سیارے دوسرے سیاروں کے مقابلے میں چنے کے دانے کے برابر ہیں۔ جو کچھ رسد گاہوں سے نظر آرہا ہے اُس کے مقابلے میں ہماری زمین ایسی ہے جیسے کسی بڑے سمندر میں کوئی تنکا چھوڑ دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو مَلَکُوْتُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کا مشاہدہ کروایا۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

لَوْ کَانَتِ الدُّنْیَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰہِ جَنَاحَ بَعُوْضَۃٍ مَا سَقٰی کَافِرًا مِنْھَا شُرْبَۃَ مَاءٍ[1]

اگر یہ دنیا اللہ کے نزدیک مچھر کے پَر کے بھی برابر ہوتی تو کافر کو ایک گھونٹ پانی نہ دیتے۔ ان لوگوں کو ایک تنکے کا احساس ہے کہ چالیس کروڑ کے بیچ میں یہ چیز نظر آگئی اور اللہ

---

[1]: سننِ ترمذی: ۲۴۹۰۔

تعالیٰ کی مخلوق اس سے زیادہ ہے۔ ان لوگوں نے اپنی دُور بینوں سے جنت کو نہیں دیکھا، جہنم کو نہیں دیکھا، انہوں نے کرسی اور عرش کا مشاہدہ نہیں کیا۔ ان لوگوں کو کیا معلوم کہ ابھی اور کیا کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے پوری مخلوق کو وجود دیا۔ وجود دینے کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق نہیں تھی اللہ تعالیٰ نے بنائی اور قیامِ ہستی دی یعنی جن چیزوں سے یہ تمام چیزیں بنی ہوئی ہیں، انہیں یہ سب کچھ دیا۔ یہاں آدمی کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اگر وہ سوچنا چاہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پوری مخلوق کو "نہیں" سے "ہاں" کیا۔ جبکہ ایک شے بھی نہیں تھی۔ تو اُس کی عقل اس مضمون کو نہیں پکڑ سکتی۔

كَانَ اللّٰهُ وَ لَمْ يَكُنْ شَيْءٌ غَيْرُهٗ [۱]

اللہ تعالیٰ تھے اور اللہ کے ساتھ کوئی شے نہیں تھی، ایک ذرّہ بھی نہیں تھا۔

کائنات میں پائے جانے والے مادّے کے بارے میں ایک عقیدہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اہلِ اسلام اور اہلِ سائنس کے درمیان عقیدے کی بنیاد یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ اہلِ سائنس پوری کائنات کے مٹیریل کو قدیم مانتے ہیں۔ زمین کیسے بنی؟ چاند کیسے بنا؟ ستارہ کیسے بنا؟ مریخ کیسے بنا؟ آسمان اور زمین کیسے بنے؟ یہ الگ چیز ہے۔ اس سے قطع نظر فلاسفۂ قدیم اور فلاسفۂ جدید ایٹموں اور ذرّات سے بنی کائنات کے قدیم ہونے کے قائل ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ کائنات ہمیشہ سے ہے جبکہ اسلام پہلے دن سے یہ کہہ رہا ہے:

''كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ مَعَهٗ شَيْءٌ''

کہ اللہ تعالیٰ تھے اور اس کے ساتھ کوئی چیز نہیں تھی۔

۱: صحیح البخاری: ۳۱۹۱۔

قدیم صرف اللہ تعالیٰ کی صفتِ خاصہ

مادّہ قدیم نہیں ہے، مادّہ اللہ کے برابر نہیں ہے۔ قدیم اللہ تعالیٰ کی صفتِ خاصہ ہے، (اللہ تعالیٰ کے لئے لفظِ قدیم کا استعمال فلاسفہ کی اصطلاح کے اعتبار سے ہے ورنہ اس سے بہتر تعبیر اَلْاَوَّلُ ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہے) اُس میں کوئی بھی شریک نہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ازل سے ہیں اور کوئی چیز ازل سے نہیں ہے۔ یہ میٹریل جس سے یہ کائنات بنی ہے، یہ اللہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک بدیہی چیز ہے۔ اگر ہم اس کو ہمیشہ کا مان لیتے ہیں تو یہ اللہ کے برابر ہو جاتا ہے اور اسلام نے ہمیں پہلے دن سے بتایا کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ جب کبھی اہلِ اسلام اور اہلِ سائنس میں بحث ہوتی ہے، سائنس کا فلسفہ "حقائقِ کائنات" ہے یعنی کسی چیز کی حقیقت کو پہچاننا۔ فلسفی ہر چیز کی حقیقت کو جاننے کی کوشش کرتا ہے جبکہ فلسفی کو خود اپنی حقیقت نظر نہیں آتی۔ جو کچھ اُس کو نظر آرہا ہے بس وہ اُسی کو حقیقت سمجھتا ہے اور جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ اُسے نظر آرہا ہے اور اُس کے لیے وہی حقیقت ہے۔ حضور ﷺ کے اعجازِ علم کو پہچانیۓ اور ان کے علم کا اندازہ لگائیے۔ حضور ﷺ نے دُعا سکھائی:

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا [1]

اے اللہ! جو چیز حق ہے اُسے حق دکھایئے۔

اسلام اور علمِ سائنس کا موازنہ

مخلوق کو مخلوق کی حیثیت کا سمجھ میں آنا بہت بڑی چیز ہے۔ سائنس یہ تو بتاتی ہے کہ فلاں چیز کیا ہے؟ لیکن یہ نہیں بتاتی کہ فلاں چیز کیوں ہے؟ "چیزوں" میں وہ صرف وہی بتاتی ہے جو

---

[1]: تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۱۰۔

نظر آرہا ہوتا ہے، اُس کے باطن کا سائنس بھی نہیں بتاسکتی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آدمیوں کو سائنس کے ذریعے سے حاصل ہونے والا علم محدود ہے جبکہ آسمانی علم سائنس کے علم سے بہت بڑا ہے۔ آپ اس سے یہ بھی اندازہ لگاسکتے ہیں کہ قرآن وحدیث کا علم سائنس کے علم سے کتنا بڑا ہے، کیونکہ سائنس جو کچھ بتاتی ہے وہ انتہائی محدود ہے۔ تمام مخلوق جو سائنس والوں کو نظر آرہی ہے، ان تمام مخلوق کے سامنے دنیا کی کیا حیثیت ہے؟ اس کے مقابلے میں اللہ کی کرسی کا کیا حال ہے؟ اس کے مقابلے میں اللہ کے عرش کا کیا حال ہے؟ جس اللہ نے اپنے علمِ مبارک سے ان کو وجود بخشا، وجود بخشنے کے بعد ان کو قائم فرمایا۔

حاملانِ عرش کی تسبیحات

غرض یہ کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ کرسی کے چار پائے ہیں اور چاروں پایوں کو چار فرشتے تھامے ہوئے ہیں اور ہر فرشتے کی لمبائی اور چوڑائی آسمان کو محیط ہے یعنی ایک ایک فرشتہ بہت بڑا ہے اور حق تعالیٰ نے اُن چاروں کو الگ الگ شکل میں بنایا ہے۔ کرسی کے ایک پائے کو تھامنے والے فرشتے کی صورت آدم کی صورت میں بنائی ہے اور اُس کا کام اللہ تعالیٰ سے تمام بنی آدم کے لیے روزی کی بھیک مانگتے رہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ بغیر مانگے بھی دیتے ہیں لیکن اُن کی ایک قدرت ہے، اُن کا ایک کمال ہے، اُن کی ایک بڑائی ہے، یہ بھی بتانے کے واسطے کہ وہ کیسے غالب ہیں، وہ کیسا ارادہ اور قدرت رکھنے والے ہیں، اتنی بڑی مخلوق کو اس بات پر مامور فرمادیا کہ وہ کرسی کا ایک پایا تھامے ہوئے ہے اور اللہ تعالیٰ سے بنی آدم کے لیے روزی کی دُعا کررہا ہے۔ کرسی کے دوسرے پائے کو تھامنے والے فرشتے کی صورت بقر (بیل) کی سی بنائی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے تمام حیوانات کی روزی کے لیے دُعا کرتا رہتا ہے۔ بقر بنانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بیل

جیسا ہے۔ وہ اتنا لمبا چوڑا ہے کہ آسمان اور زمین اُس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہیں مگر اُس کی شکل بصورت گائے بنائی ہے کہ وہ تمام حیوانات کے لیے روزی کی دُعا کر تا رہتا ہے۔ کرسی کے تیسرے پائے کو تھامنے والے فرشتے کی صورت اسد (شیر) کی سی بنائی ہے جو تمام درندوں کا سردار ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے تمام درندوں کے لیے روزی کی دُعا کر تا رہتا ہے۔ کرسی کے چوتھے پائے کو تھامنے والے فرشتے کی صورت گدھ کی صورت میں بنائی ہے، اُسے تمام پرندوں کا سردار شمار کیا جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے تمام پرندوں کے لیے روزی کی دُعا کرتا رہتا ہے۔[1] اور اللہ تعالیٰ اس کی دعا کے بغیر بھی روزی نازل کر سکتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قہاریت، بڑائی اور عظمت کو بتانے کے لئے ہی نظام رکھا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ، اُن کی دُعاؤں کو قبول کرتے ہیں اور مخلوق پر روزی نازل فرماتے ہیں۔ جب سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے مخلوق بنائی ہے، اُس وقت سے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے دونوں ہاتھوں سے بخشش فرماتے رہتے ہیں۔

حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے دونوں ہاتھوں سے بخشش فرماتے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں۔[2] دایاں بایاں تو اُس کے لیے ہوتا ہے جو محدود ہوتا ہے۔ لیکن محض حق تعالیٰ شانہ کی قدرت بتانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے لیے ہاتھ کا لفظ استعمال ہوتا ہے (اور دائیں سے تعبیر بابرکت ہونے کو بتانے کے لئے ہے)۔ عام طور پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دو ہاتھ دیئے ہیں تو انسانوں کو شبہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھی ایسے ہی دو ہاتھ ہیں دایاں اور بایاں، لیکن معاملہ ایسا نہیں ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

''یَدُ اللهِ مَلْأٰی'' اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بھرے ہوئے ہیں۔

۱: تفسیر مظہری: ۱ / ۲۶۸۔ ۲: تفسیرِ مظہری: ۳۵۹۔

''لَا تَغِیْضُھَا نَفَقَۃٌ سَحَّاءُ اللَّیْلِ وَ النَّھَارِ''[۱]

اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے اپنے خزانوں اور نعمتوں کو شب و روز برسانے سے کسی قسم کی کمی نہیں آتی۔ جب سے اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو بنایا ہے اُس وقت سے اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی قدرت کے خزانے لٹاتے رہتے ہیں۔ مخلوق کھائے یا نہ کھائے، پیئے یا نہ پیئے مگر مخلوق کی روزی برابر نازل ہوتی رہتی ہے۔ جانوروں کی، حشرات، درندوں کی، پرندوں کی، انسانوں کی روزی مسلسل اُترتی رہتی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے بڑی بڑی مخلوق بنائی ہے، معلوم ہی نہیں ہے کہ وہ کیا کھایا کرتی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت کا قصہ

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت کا قصہ بہت مشہور ہے۔ اسکی اصل بھی ہوگی۔ اگر یہ بے اصل ہوتا تو اتنا مشہور نہیں ہوتا اور معتبر علماء کے کلام میں یہ بات نہیں آتی۔ معتبر علماء نے بھی بیان کیا ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ اے اللہ! میں آپ کی مخلوق کی دعوت کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے سلیمان! یہ ہمارا کام ہے، آپ کے بس کی بات نہیں ہے، آپ کو پوری دنیا کی حکومت مل گئی، جنات اور ہوا آپ کے تابع ہوگئے، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ یہ کام بھی کرپائیں گے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ اے اللہ! ایک مرتبہ مجھے دعوت کرنے دیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جنات تھے، اُن سے بڑی بڑی دیگیں بنواتے تھے۔ خود قرآن پاک میں ہے کہ وہ جنات ایسی بڑی بڑی لگن اور دیگیں بناتے تھے جیسے حوض کہ اُن کو ہلایا نہیں جاسکتا تھا۔[۲] جنات سے کھانا پکوانا شروع کروایا، جانوروں کے لیے چیزیں تیار کروائیں، پرندوں کے لیے

۱: صحیح البخاری: ۱۵ /۳۱۷۔ ۲: سبأ: ۱۳۔

چیزیں تیار کروائیں۔ سمندر کے کنارے ڈھیر کا ڈھیر لگا دیا اور اعلان ہوا کہ فلاں وقت کھانے کا ہے لہٰذا مخلوق جمع ہو جائے۔ ایک مچھلی سمندر سے بر آمد ہوئی اور کہا کہ مجھے بھوک لگ رہی ہے، کھانا دے دیا جائے۔ کہا گیا کہ ٹھیک ہے، اس کو کھانا دے دیا جائے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جتنا کچھ تمام مخلوق کے لیے بنوایا تھا اُس مچھلی نے ایک ہی لقمے میں سب ہڑپ کر ڈالا۔ پھر اُس کے بعد کہا کہ اے سلیمان! میری بھوک ختم نہیں ہوئی۔ وہ حیرت میں پڑ گئے کہ اے اللہ! یہ کیا ماجرا ہے، میں تو سمجھا تھا کہ یہ کھانا سب کو کافی ہو جائے گا، مگر یہ تو ایک مچھلی کو بھی بس نہیں ہوا۔ اس مچھلی نے کہا کہ اے سلیمان! آپ اسی پر عاجز ہو گئے، اللہ مجھے روزانہ ایسے تین لقمے دیتا ہے،[1] اللہ تعالیٰ کا یہ نظام ہے، انہوں نے مخلوق کو بنایا ہی ایسا ہے۔ کون کون سی مخلوق کہاں کہاں کس نوعیت کی ہے اور اس کی ربوبیت کا انتظام صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔ ایسی مخلوق بھی بنائی ہے جنہیں کچھ کھانا پینا ہی نہیں ہے۔

جیسے کرسی کو تھامنے والے چار فرشتے ہیں اور ایک ایک فرشتہ آسمان اور زمین سے بڑا ہے، اُس کو بھوک ہی نہیں لگتی۔ اللہ تعالیٰ چاہیں تو مچھر اور چیونٹی کو بھی بھوک لگے اور اللہ تعالیٰ نہ چاہیں تو جبرئیل جیسے فرشتے اور عرش و کرسی کو تھامنے والے فرشتوں کو بھی بھوک نہ لگے۔ بھوک بنانا اور بھوک کو مٹانے کا انتظام کرنا بھی اُن کا کام ہے اور بھوک ہی نہ بنانا وہ بھی اُن کا کام ہے۔ ہم جتنا سوچیں گے حق تعالیٰ شانہ، کی قدرت کے عجیب وغریب نظارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ ایک طرف چھوٹی سی چیونٹی کے اندر پورا نظام ہے اور اُس میں بھوک بھی ہے اور پیاس بھی ہے، خواہشات بھی ہیں اور دوسری طرف عرش و کرسی کو تھامے ہوئے فرشتوں کو نہ بھوک لگتی ہے، نہ پیاس لگتی ہے، نہ اُن کو نیند آتی ہے، نہ اُن کو تھکان ہے وہ اللہ

---

[1] نفحۃ العرب: ۸۷ – ۸۸۔

تعالیٰ کے برابر تو نہیں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کو جس اعتبار سے بنایا ہے وہ مضبوط اور طاقتور ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ، نے اپنے بندوں سے اپنا تعارف کرواتے ہوئے فرمایا کہ میں ایسی صفات والا ہوں اور میرا یہ نظام ہے اور یہ میری کرسی ہے اور کرسی کا یہ نظام ہے، آسمان و زمین میرے قبضے میں ہیں اور میں ایسی طاقت والا، قدرت والا ہوں کہ میرے سامنے کوئی جرأت نہیں کر سکتا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا کہ جب سے بنی اسرائیل نے بچھڑے کو معبود بنایا اُس کے چہرے پر خراش پڑ گئی۔[۱] اس سے اُس فرشتے کی کیا مناسبت ہے، یہ حضرت علیؓ ہی جانتے ہیں۔ اور حضرت علیؓ کے علوم بڑے عجیب وغریب تھے۔

حضرت علیؓ سے پوچھا گیا کہ آپ کے علوم سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاید حضور ﷺ نے قرآن کے علاوہ علم کا کچھ حصہ آپ کو ضرور دیا ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا:

لَا... إِلَّا فَهْمًا يُعْطِيهُ اللهُ رَجُلًا فِي الْقُرْآنِ"[۲]

فرمایا کہ اس سے زیادہ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے مگر ایک فہم ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ عطا فرماتے ہیں۔

جب آدمی اپنی روحانیت میں لطافت پیدا کرتا ہے اور تعلق مع اللہ بڑھ جاتا ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے بنائے ہوئے حقائق کونیہ اُس آدمی پر کھل جاتے ہیں اور نظر آنے لگتے ہیں۔ حضرت امام باقر کے بارے میں یہ بات ملتی ہے کہ اُن کو عرش آسانی سے بیٹھے بیٹھے نظر آتا تھا۔ آسمانِ اوّل پر یہ نظر آرہا ہے، آسمانِ دوم پر یہ نظر آرہا ہے، عرش کے پاس یہ کچھ ہے، کرسی کے پاس یہ ہے۔ ان سب کی نوعیت کیا ہوتی ہے، اس کا اندازہ آدمی اس میدان میں

۱: تفسیر مظہری: ۱/ ۲۶۸۔ ۲: صحیح بخاری: ۳۰۴۷۔

قدم رکھے بغیر نہیں لگا سکتا۔ کشف کس نوعیت کا ہوتا ہے؟ بات کس طرح کھلتی ہے؟ یہ ایک میدان ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ جس کے لئے چاہتے ہیں کھول دیتے ہیں۔

روح کی لطافت

یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے روح میں بڑی لطافت رکھی ہے۔ آدمی کو پوری مخلوق کا مرتبۂ جامعہ کہا جاتا ہے، آدمی میں سارے عالَم ہیں۔ حتیٰ کہ اس میں لوحِ محفوظ تک کا نقشہ موجود ہے۔ دماغ کو لوحِ محفوظ کی ہی شبیہ قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدمی کو پوری مخلوق کا جامع بنایا ہے۔ یہ آدمی کمپیوٹر سے بھی آگے کی چیز ہے، حالانکہ آدمی کو کھول کر دیکھا جائے تو اس کے اندر کچھ بھی نہیں ہے جبکہ اس نے بچپن سے پچپن تک کیا کچھ نہیں دیکھا، کیا کچھ نہیں کیا، اس کے سینکڑوں صورتیں اور سینکڑوں الفاظ ہیں، سینکڑوں نقشے اور مناظر اُس کے پاس ہیں، اللہ تعالیٰ نے اسے پوری مخلوق کا جامع بنایا ہے۔ اگر یہ اپنی روح میں لطافت اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے تو اس پر حقائق کونیہ کھلتے ہیں۔

"کشفِ شرعی" اور "کشفِ کونی"

علماء نے لکھا ہے کہ اگر کائنات کی چیزیں کھلتی ہیں تو اُس کو کشفِ کونی کہتے ہیں اور اگر شریعت کے اسرار (بھید) کھلنے لگتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کون سا حکم کیوں دیا؟ اس کو "کشفِ شرعی" کہا جاتا ہے۔ "کشفِ شرعی" "کشفِ کونی" سے افضل ہوتا ہے۔ بزرگ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ کشفِ شرعی حاصل ہو کشفِ کونی کہ مقابلے میں۔ جب تعلق مع اللہ بڑھ جاتا ہے تو اُن کو نہ کشفِ شرعی سے زیادہ دلچسپی رہتی ہے اور نہ کشفِ کونی سے، کیونکہ اصل مقصد اللہ تبارک وتعالیٰ کی یاد اور اُن کی معرفت ہے، وہ اُس میں مستغرق ہو جاتے ہیں اور کشف سے مطلقاً نسبت ختم ہو جاتی ہے۔ ہمارے لیے تو کشف ہی بڑی چیز ہے۔

کشف کی عقلی دلیل

جب تک ٹیلی ویژن اور ریڈیو نہیں آئے تھے اگر اُس وقت کسی کو بتایا جاتا کہ یہاں کی چیز وہاں نظر آتی ہے تو وہ کیسے یقین کرتا؟ لیکن اب ہمارے لئے یہ بات کوئی تعجب کی نہیں رہی کہ امریکا والے انڈیا کے آدمی کو دیکھ رہے ہیں اور انڈیا والے امریکا کے آدمی کو دیکھ رہے ہیں، اِدھر سے اُدھر آنِ واحد میں بات ہو رہی ہے لیکن جب تک یہ چیزیں وجود میں نہیں آئی تھیں اُس وقت یہ چیزیں لوگوں کے لیے اچنبھا تھیں، ان مادّی چیزوں سے زیادہ چیزیں آدمی کے اندر موجود ہیں۔ جیسے آج کا آدمی ٹیلی ویژن کے ذریعے سے دُور کی چیزیں دیکھ سکتا ہے، بغیر ٹیلی ویژن کے ذریعے آدمی میں یہ صفت ہے کہ وہ دُور تک کی چیزوں کو دیکھ لے اور کئی اولیاء اللہ دیکھتے تھے۔ اسی کا نام کشف ہے۔ جیسے آپ ہوائی جہازوں اور راکٹوں کے ذریعے سے بڑی مسافتوں کو طے کر لیتے ہیں تو ہزاروں اولیاء اللہ ایسے گزرے ہیں جن کو طَیُّ الْمَسافَۃ کی کرامت حاصل تھی، ایک قدم اُٹھاتے تھے تو ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچ جاتے تھے۔

"کرامت" اور استدراج

یہ واقعات اتنے کثرت سے ہوئے ہیں کہ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ جیسے آدمی کشتی میں چلتا ہے ایسے ہی آدمی کے اندر صلاحیت ہے کہ وہ بغیر کشتی کے بھی چلے۔ جیسے آدمی مختلف چیزوں کے ذریعے سے پانی اور زمین کے اندر جا سکتا ہے ایسے ہی بغیر چیزوں کے آدمی پانی کے اندر جا سکتا ہے۔ ہمارے بزرگوں کی تمام کرامتیں آج دنیا میں گشت کر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے بزرگوں کو ان اسباب کے بغیر طاقت دی تھی، اب دنیا ان چیزوں کو اسباب کے ساتھ کر رہی ہے۔ ورنہ ہوا میں اُڑنے کا کام، زمین کے اندر جانے کا کام، تبدیلیٔ ماہیت یعنی چیز

کے بدل جانے کا کام تک ہوتا تھا۔ ان تمام چیزوں کے لیے ایمان بھی شرط نہیں ہے۔ اگر آدمی بغیر ایمان کے نفس پر زیادہ مجاہدہ کرتا ہے تو یہ چیز حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر ایمان کے ساتھ ایسا خلافِ عادت کام ہو تو اسے "کرامت" کہتے ہیں اور اگر بغیر ایمان کے یہ چیز حاصل ہو تو اسے "استدراج اور ڈھیل" کہتے ہیں۔ جوگیوں، سنیاسیوں، راہبوں وغیرہ کے واقعات اسی قبیل سے ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں اب بھی ایسے جوگی موجود ہیں کہ آپ ہاتھ کھولیں تو آپ کے ہاتھ گلاب کا پھول دے دیتے ہیں، لیموں اور لڈّو ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ سائی بابا کی پوجا اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ جو بھی اُس کے پاس جاتا ہے اور ہاتھ پھیلاتا ہے وہ اُس کے ہاتھ میں لڈّو تھما دیتا ہے۔ بعض مجاہدے ایسے ہوتے ہیں جن کے ذریعے سے یہ چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں۔

ایک بزرگ کی کرامت

ایک بزرگ کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک جوگی نے اُن سے کہا کہ میں ہوا میں اُڑنے کے لیے تیار ہوں۔ اسلامی بادشاہت تھی۔ جوگی نے کہا کہ میں حق پر ہوں، میرے نفس میں اتنی لطافت ہے، میں اُڑ سکتا ہوں۔ اُس نے اُڑ کر دکھا دیا۔ جب بادشاہ نے یہ دیکھا تو سوچا کہ اس کا جواب ضرور ہونا چاہیے، ورنہ لوگ اسلام سے متنفر ہو جائیں گے۔ غالباً حضرت سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں اس کے ساتھ اُڑوں گا تو اُس میں اور مجھ میں کیا فرق رہے گا لہٰذا جب یہ جوگی اُڑے گا تو اس کے ساتھ میرا جوتا اُڑے گا۔ چنانچہ جب جوگی نے اُڑنا شروع کیا تو اُس کے ساتھ حضرت سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا جوتا اُڑنے لگا، جوگی جتنا اوپر اُڑ سکتا تھا وہ اُڑا، حضرت کے جوتے اُس کے سر پر جا کر برسنا شروع ہو گئے۔ تب اُس نے اسلام کو قبول کیا۔

لطافتِ نفسِ ناطقہ کے نتائج

جب نفسِ ناطقہ میں لطافت پیدا کی جاتی ہے تو اُس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ایسی چیزیں دے دیتے ہیں۔ ایسے علم کو کشفِ کونی کہتے ہیں کہ سمندر میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ نظر آرہا ہے، قریب یا دُور میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ نظر آرہا ہے۔ کشفِ شرعی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نماز کو کیوں فرض کیا؟ روزے کو کیوں فرض کیا؟ حج میں کیا کیا حکمتیں اور مصلحتیں ہیں۔ کچھ عورتیں حلال اور کچھ حرام ہیں، آخر ایسا کیوں ہے؟ یہ جانور حلال اور یہ حرام ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ آخر اس جانور میں بھی گوشت ہے اور اُس جانور میں بھی گوشت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان اسرار کو کھولتا ہے۔ اہل اللہ نے باضابطہ اس موضوع پر کتابیں لکھی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" ہے جس میں اس قسم کے اسرار بیان کیے گئے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی کتاب موجود ہے۔ غرض یہ کہ یہ کشفِ شرعی کہلاتا ہے۔

جب عام انسانوں کے ساتھ یہ کشف کا معاملہ ہوتا ہے تو نبیوں کے ساتھ میں کیا کچھ نہیں ہوا ہوگا۔ جب نبیوں کے ساتھ میں یہ ہوتا ہے تو امام الانبیاء ﷺ کے ساتھ میں کیا کچھ نہیں ہوا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مخلوق پر جتنا کھولتے ہیں صرف اُسی کا علم مخلوق کو ہوتا ہے، اس سے زیادہ مخلوق کو اور کچھ نہیں ملتا، مگر مخلوق کا علم خالق کے علم کے مقابلے میں کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو کرسی کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں اُس پر یہ بات نکل آئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کرسی کے بارے میں تفصیلات کشف کے ذریعے سے حاصل ہوئیں یا حضور ﷺ سے حاصل ہوئیں۔

اب اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی مخلوق بنائی، جس نے اتنی بڑی مخلوق بنائی وہ خود کتنا بڑا ہو گا۔ وہ سب کو محیط ہے۔ اُس کے احاطے کی کیفیت بھی بڑی عجیب و غریب ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اوپر تو سب کو جانتے ہیں مگر اندر سے نہیں جانتے۔ ہمارا حساب یہ ہے کہ ہم کٹورا سامنے رکھتے ہیں، اُس کو اُلٹا کر دیا تو ہمیں کٹورے کا اوپری حصہ تو نظر آتا ہے لیکن اندر کا نظر نہیں آتا۔ انسان کا جسم چاروں طرف سے کھول دیا، لیکن جگر کے اندر کیا کچھ ہے وہ نظر نہیں آتا۔ آپ نے کوئی چیز توڑ دی تو توڑنے کے بعد وہ نظر آتی ہے لیکن اُس کا ذرّہ نظر نہیں آتا۔ اگر کسی کو ذرّہ نظر آرہا ہے تو وہ ذرّہ حقیقتاً کیا ہے اُس کا علم نہیں ہوتا۔

جگر ذرّے کا چیریں تو لہو خورشید کا ٹپکے

اگر آپ ذرّے کا جگر چیریں گے تو خون سورج کا نکلے گا یعنی سورج میں بھی وہی بات ہے اور ذرّے میں بھی وہی بات ہے۔ آج کی سائنس یہی بات کہہ رہی ہے۔ جو نظامِ شمسی سورج کے اطراف میں گھومتا ہے ہر ذرّے کے ساتھ ویسا ہی نظامِ شمسی ہے۔ ذرّے سے مراد ایٹم ہے۔

اسماءِ باری تعالیٰ کی تجلیات

قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب "مقاماتِ مقدسہ" کے نام سے ہے۔ انہوں نے اس پر بڑی عجیب و غریب گفتگو فرمائی ہے۔ اُس میں انہوں نے فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہ، نے دنیا میں اپنے اسماء کی تجلیات پھیلا رکھی ہیں۔ پوری دنیا میں سوائے اللہ تعالیٰ کے ناموں کے ظہور کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ پوری دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ناموں اور صفات کا ظہور فرما رکھا ہے۔ جیسے پوری آگ میں اللہ تعالیٰ کی قیومیت کی تجلی ہے۔ اللہ تعالیٰ قائم رکھنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا قیام حرارت سے رکھا ہے۔ ایسے ہی پورے پانی پر اللہ تعالیٰ کی صفتِ "حیّ" کی تجلی ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ [1]

ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندہ کیا ہے، کیا تم ایمان نہیں رکھتے۔

نظامِ کائنات کا مقصد

پوری کائنات میں اللہ تعالیٰ کے اسماء کا ظہور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اس لیے بنایا ہے کہ اُس سے اللہ تعالیٰ کو پہچانا جائے۔ اس لیے اس کو سلسلۂ ربوبیت نہیں کہتے یعنی ہمیں جو کچھ نظر آرہا ہے یہ پالنے کا نظام نہیں بلکہ درحقیقت یہ سلسلۂ معرفت ہے۔ حق تعالیٰ کو پہچاننے کے لیے یہ کائنات بنائی گئی۔ اگر اس نظام کے بغیر اللہ تعالیٰ فرماتے کہ میں بہت بڑا ہوں، تو ہمیں سمجھ میں نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ کتنے بڑے ہیں۔ اگر اس نظام کے بغیر اللہ تعالیٰ فرماتے کہ میں بہت حکیم ہوں، تو ہماری سمجھ میں اللہ تعالیٰ کی حکمت نہیں آتی۔ اگر اس نظام کے بغیر اللہ تعالیٰ فرماتے کہ میرا علم بہت عجیب و غریب ہے تو مخلوق سمجھ نہیں پاتی کہ اللہ تعالیٰ کا علم کیا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت، اللہ تعالیٰ کی قدرت، اللہ تعالیٰ کا علم، اللہ تعالیٰ کی حیات، اللہ تعالیٰ کا ارادہ، اللہ تعالیٰ کی طاقت ان میں سے کسی بھی صفت کا مخلوق کو ذرّہ برابر بھی اندازہ نہیں ہوتا اگر اللہ تعالیٰ اتنا بڑا نظام انسان کے سامنے قائم نہ فرماتے۔ اس لیے فرمایا:

وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ

مخلوق نہیں احاطہ کر سکتی اللہ تعالیٰ کی معلومات میں سے کسی چیز کا مگر وہی جو اللہ چاہے

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ

اُس کی کرسی آسمان و زمین کو وسیع ہے

---

[1]: الانبیاء: ۳۰۔

کرسی باری تعالیٰ کا محلّ جلوس نہیں

میں یہ بات عرض کر رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کرسی وسیع ہے۔ صرف یہ تسلیم کیا جائے گا کہ کرسی ایک مخلوق ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ کرسی ایک ذی جسم چیز ہے، مخلوق ہے اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمادیا کہ وہ کتنی بڑی ہے۔ کرسی اللہ تعالیٰ کا محل جلوس یا محل نزول نہیں ہے جیسے ہم تخت پر بیٹھے ہوئے ہیں، فرش پر بیٹھے ہوئے ہیں، ویسے اللہ تعالیٰ کرسی پر نہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نہ کرسی پر ہیں اور نہ عرش پر ہیں۔

کرسی سے کیا مراد ہے؟

امام نسفی رحمۃ اللہ علیہ نے کرسی کی تفسیر، علم سے کی ہے[۱] کہ "کرسی" سے مراد علم ہے، اُن کا علم وسیع ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم کرسی کے مقام پر ہے۔ جیسے مخلوق کے اقتدار میں کرسی کا ایک مقام ہوتا ہے ایسے ہی علم کا اللہ کے پاس ایک مقام ہے جس کی وجہ سے تمام مخلوق اللہ تبارک وتعالیٰ کے قبضے میں ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے تب ہی تو مخلوق بنی ہے اور اللہ تعالیٰ کو علم ہے تو اللہ تعالیٰ کا ارادہ اُس سے متعلق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے تب ہی تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت اُس پر نافذ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے تب ہی تو یہ مخلوق کہیں بھاگ نہیں سکتی۔ بعضوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس سے مراد "ملکیت" اور "بادشاہت" ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا اقتدار اور ملک آسمان اور زمین میں وسیع ہے۔ بادشاہوں کا اقتدار اپنے ملک میں محدود ہوتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا ملک آسمان اور زمین کو محیط ہے۔

---

[۱]: تفسیرِ نسفی: ۱/ ۲۱۰۔

بعضوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس سے مراد بزرگی اور عظمت ہے۔ وسع کرسیہ کا مطلب وسع عظمتہ،، اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت آسمانوں اور زمینوں پر ہے۔ مفسرین نے یہ بھی ترجمہ کیا ہے کہ کرسی کسی چیز کی اصل یا بنیاد کو کہتے ہیں۔ اس طرح کہتے ہیں کہ مکان کی کرسی ذرا اونچی رکھنا، عام طور پر بادشاہ کی طرف کرسی کی نسبت اسی لیے کی جاتی ہے کہ وہ بنیاد ہے، کرسی پر جم کر وہ رعایہ پر حکومت کرتا ہے۔ دراصل کرسی کسی چیز کی اصل یا بنیاد کو کہتے ہیں۔ تو یہاں یہ معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں، کیونکہ مخلوقات کا نظام اور ان سے متعلق احکام وہیں سے نافذ ہوتے ہیں۔ یہ مطلب بھی بتایا گیا ہے، چونکہ مخلوق اسی سے سمجھتی ہے اس لیے مخلوق کو سمجھانے کے لئے یہ تعبیر اختیار فرمائی۔ یہ چاروں معنی لینے کے باوجود یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ کرسی ایک مخلوق ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنائی ہے اور اس کے ذریعے سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے دیگر مخلوقات کے اوپر اپنا ایک اثر قائم فرمایا ہے، اس لیے مفسرین نے فرمایا ہے کہ احادیث سے پتہ چلتا ہے کرسی مخلوق ہے۔[۱] جیسے آسمانِ اوّل مخلوق ہے، آسمانِ دوم مخلوق ہے اور حق تعالیٰ شانہ، نے ان کے ذریعے سے اپنی دیگر مخلوقات پر اقتدار قائم فرمایا ہے۔ اب اس مخلوق کے ذریعے سے ان معانی کو کیونکر مراد لیا جاتا ہے اور اس کا ان کے ساتھ کیونکر تعلق ہے، اس میں باریکیاں ہیں۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

جب یہ بات سمجھ میں آگئی کہ کرسی یا عرش اللہ تعالیٰ کا محل جلوس نہیں ہے اور ہو بھی نہیں سکتا، اس لیے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ اوپر ہی ہیں، نیچے نہیں ہیں۔ آج کل سلفیوں کو اس بارے میں بڑی شدت ہے۔ جو کوئی بھی عرب گیا تو وہاں پر اُس سے انٹرویو لیا

---

[۱]: تفسیر قرطبی:۳ /۲۵۶۔

جاتا ہے اور پوچھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کہاں ہیں؟ اگر وہ یہ بتائے کہ آسمان میں ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اُس کا خروج لگا دیتے ہیں۔

یہ لوگ استدلال کے طور پر یہ پیش کرتے ہیں کہ ایک باندی حضور ﷺ کے پاس آئی۔ حضور ﷺ نے اُس کے ایمان کے امتحان کے لیے پوچھا کہ اللہ کہاں ہے؟ اُس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ حضور ﷺ نے اُس کو مؤمن قرار دے دیا۔[1]

اس سے یہ سلفی سمجھتے ہیں کہ اس سے اللہ تعالیٰ کو آسمان پر ہی قرار دیا جائے گا۔ ایسی بات نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ علی اور بلند ہیں، انسان بلندی کو سمجھنے کے لیے اوپر والی جہت کو تعبیر کرتا ہے، اس لیے عام طور پر اللہ تعالیٰ کی نسبت اوپر کی طرف کی جاتی ہے، مگر اللہ تعالیٰ کو مقید نہیں کیا جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ اوپر ہی ہیں، نیچے نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اوپر ہیں، دائیں طرف نہیں ہیں حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نہ زمان میں آتے ہیں اور نہ مکان میں آتے ہیں۔

تُو بَری ہے قیدِ زمان سے
تُو بَری ہے قیدِ مکان سے

اللہ تعالیٰ نہ ماضی، حال، مستقبل کے زمانے میں آتے ہیں اور نہ اللہ تعالیٰ جگہ میں آتے ہیں۔ یہ تمام جہتیں ہمارے اعتبار سے ہیں۔ ساری جہتیں اللہ تعالیٰ نے بنائی ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ جہتیں بنانے سے پہلے سے ہیں تو پھر وہ کسی جہت میں کیونکر ہوں گے؟ جہت خود اُس کے بعد میں بنی، اللہ تعالیٰ کو کسی جہت میں مقید نہیں کیا جاسکتا۔ مگر جب آدمی دُعا کرے گا تو

۱: صحیح مسلم: ۵۳۷۔

آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھائے گا۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی جائے گی تو آسمان ہی کی طرف کی جائے گی لیکن یوں نہیں کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ اوپر ہی مقید ہیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ ساتویں زمین پر رَسّی چھوڑو گے تو وہ سیدھی اللہ تعالیٰ کے پاس جائے گی۔[1] یہ بھی تو حدیث ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ کو کسی جہت کے ساتھ مخصوص نہیں کریں گے۔ بقیہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے پوری مخلوق کے اوپر کرسی بنائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کرسی کے اوپر عرش بنایا ہے اور عرش کے اوپر کیا ہے یہ اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت ہے۔ آدمی کی عقل عرش تک کس درجے میں سمجھ سکتی ہے۔ عرش کے بعد کیا ہے عماء (خفا) ہے "كَانَ فِي عَمَاء"۔[2] اس کے اوپر صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے۔ آدمی وہاں تک سمجھ سکتا ہے لیکن یوں نہیں کہا جاسکتا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ عرش پر ہیں۔

" الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى "

اسی وجہ سے ''الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى'' متشابہات میں سے ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رحمن عرش پر بیٹھا ہوا ہے۔ تمام اہل السنۃ والجماعۃ کہتے ہیں کہ یہ متشابہات میں سے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس کی مراد کو زیادہ جانتے ہیں۔ ہم یوں کہیں گے کہ استویٰ معلوم ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ عرش پر مستوی ہیں۔ مگر کیفیت مجہول ہے۔ کیسے بیٹھے ہوئے ہیں، ہمیں یہ نہیں معلوم ہے، کیونکہ اگر بیٹھ گئے تو اُن کا محدود ہونا لازم آجائے گا اور وہ اللہ ہی نہیں ہوتا جو محدود ہو۔ اللہ تعالیٰ ذی جسم نہیں ہیں جبکہ عرش جسم والی چیز ہے، کرسی جسم والی چیز ہے اور اللہ تعالیٰ جسم سے پاک ہیں کیونکہ جسم میں بھی نقص اور عیب ہے۔

ا: سنن ترمذی:۳۲۹۸۔ ۲: سننِ ترمذی:۳۱۰۹۔

جسمِ اطہر سے مس شدہ حصۂ زمین کی فضیلت

یہاں ایک بات اور ذہن میں آئی کہ جب اللہ تعالیٰ عرش اور کرسی پر بیٹھے ہوئے نہیں ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف عرش اور کرسی کی نسبت ویسی نہیں ہے جیسے حضور ﷺ کی طرف روضۂ مبارک کی نسبت ہے۔

حضور ﷺ اپنی قبر مبارک میں ہیں اور اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھے ہوئے نہیں ہیں۔ "الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" کا مطلب تمام اہل السنۃ والجماعۃ یہ کرتے ہیں کہ کَیْفِیَّتُهٗ مَجْهُوْلٌ، اس کی کیفیت مجہول ہے اور اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔[۱] یہ بات سب جانتے ہیں۔

چونکہ اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھے ہوئے نہیں ہیں۔ اس لیے علماء نے یہ فرمایا ہے کہ زمین کا وہ حصہ جو جسم اطہر کے ساتھ لگا ہوا ہے وہ عرش سے بھی افضل ہے۔[۲] اس پر لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ حضور ﷺ روضہ میں ہیں اور اللہ تعالیٰ عرش پر ہیں، کیا حضور ﷺ کا مرتبہ عرش سے بڑھ گیا؟ حالانکہ حضور ﷺ کو جو حضوری اور مرتبہ حاصل ہے وہ اللہ تعالیٰ کی وجہ سے ہے۔

"اَحِبُّوا اللّٰهَ لِمَا يَغْذُوْكُمْ مِنْ نِعَمِهٖ وَأَحِبُّوْنِيْ لِحُبِّ اللّٰهِ"[۳]

اللہ تعالیٰ سے محبت کرو کیونکہ وہ تمہارا محسن اور منعم ہے اور مجھ سے محبت کرو کہ اللہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ تو سارا معاملہ اللہ تعالیٰ ہی کی وجہ سے ہے۔

۱: کتب ورسائل وفتاویٰ ابن تیمیہ: ۱۳ / ۳۰۹۔ ۲: ارشاد الساری: باب مسجد قبا و مرقاۃ: باب المساجد ومواضع الصلوۃ۔ ۳: سننِ ترمذی: ۳۷۸۹۔

حضور ﷺ کا مرتبہ اور عظمت اللہ تعالیٰ ہی کی وجہ سے ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ سب سے مقدم ہیں۔ بقیہ اس مضمون میں بعض لوگوں کو یہ شبہ ہو گیا ہے کہ علماء نے یہ بات کیسے لکھ دی؟ تمام مستند اور بڑے بڑے علماء یہ لکھتے ہیں کہ روضۂ مبارک میں جسم اطہر بالاتفاق عرش سے افضل ہے۔ جسم مبارک تو افضل ہے ہی مگر زمین کا وہ حصہ جو جسم اطہر کے ساتھ لگا ہوا ہے، وہ بھی عرش سے افضل ہے۔ اس پر لوگ کہتے ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

وہ ایسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر ہونے کا مفہوم یہ سمجھا گیا کہ وہ عرش پر مستویٰ ہیں در اصل سمجھنے کی چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش یا کرسی پر بیٹھے ہوئے نہیں ہیں کیونکہ وہ جسم والے نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف عرش و کرسی کی نسبت ایسی ہی ہے جیسے بیت اللہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ وہاں سے اللہ تعالیٰ مخلوقات پر تصرفات فرماتے ہیں، وہاں سے اللہ تعالیٰ کا حکم مخلوق کے علم میں آیا، وہاں سے اللہ تعالیٰ کے حکم کا نفاذ ہو رہا ہے، سدرۃ المنتہی پر مخلوق ختم ہو رہی ہے، اس کے بعد معلوم نہیں کیا ہے، انسان کے علم کو اس کے آگے کا ادرک نہیں ہے، لیکن نبی ﷺ بنفسِ نفیس روضۂ اقدس میں موجود ہیں اور روضۂ اقدس کی زمین آپ کے جسمِ اطہر سے مس ہو رہی ہے۔ یہی وہ بات ہے جس کی وجہ سے علماء کرام ایسی بات فرماتے ہیں۔

وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا

اللہ تبارک و تعالیٰ کو آسمان و زمین کی حفاظت کوئی گراں محسوس نہیں ہوتی۔

اور آسمان و زمین کی حفاظت اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی گراں نہیں ہے۔

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ

اور وہ علی یعنی بہت عالیشان ہے، تمام صفاتِ نقص سے وہ برتر اور بزرگ ہے، بڑی شان والے ہیں۔

لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ دین میں جبر نہیں۔

تِلْكَ آيَاتُ اللهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ [1]

ان آیتوں میں حضور ﷺ کی رسالت کا بیان ہے۔ اور اس کے بعد والی آیت میں توحید کا بیان ہے۔ توحید اور رسالت واضح ہو گئیں اور حق تعالیٰ شانہ، نے دونوں کو دلیلوں کے ساتھ بتا دیا اور سمجھا دیا تو جس کے اندر ذرّہ برابر بھی فطری صلاحیت باقی ہے اور اُس کے دل کو کجی نے نہیں گھیرا ہے وہ ایمان لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر وہ حضور ﷺ کی رسالت کو سمجھنا چاہے اور اللہ تعالیٰ کی توحید کو سمجھنا چاہے تو سمجھ سکتا ہے، حضور ﷺ کے ذریعے سے توحید اور رسالت کے مضامین کو اتنا واضح کر دیا گیا ہے کہ آدمی کو اللہ تعالیٰ کی توحید، صفات، قدرت، کبریائی وعظمت اور کلام کو سمجھنے میں بھی کوئی پریشانی نہیں ہو گی، اور حضور ﷺ کی نبوت پر جو دلیلیں ہیں اور آپ ﷺ کو جن نشانیوں کے ساتھ بھیجا گیا ہے وہ بھی اتنی واضح ہیں کہ رسول پاک ﷺ کی رسالت بھی چھپی ہوئی نہیں رہتی۔ جب رسالت واضح کر دی گئی کہ یہ ہمارے پیغمبر ہیں اور یقیناً ہیں، اب ان کو جھٹلانے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔ کسی بھی اعتبار سے حضور ﷺ کو دلیل سے نہیں جھٹلایا جاسکتا۔ حضور ﷺ کی رسالت پر اتنے دلائل جمع کیے گئے ہیں کہ دلیل کے اعتبار سے اب کوئی گنجائش نہیں رہی ہے کہ اُس کی تکذیب کی جاسکے۔ اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور بڑائی پر اتنی بات واضح کر دی گئی، جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، اللہ تعالیٰ نے خود ہماری عقلوں میں پہلے سے اتنی روشنی اور ہمارے دلوں میں یہ استعداد رکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کو سمجھ سکیں۔ اس لیے جب توحید اور رسالت واضح ہو گئے تو اب جو مانے گا وہ کامیابی کے راستے پر چلے گا اور جو نہیں مانے گا وہ اپنی جہنم خود بنائے

---

[1]: البقرۃ: ۲۵۲۔

گا اور اسی میں جائے گا۔ اس لیے اس کے بعد اس مضمون کو بیان فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

دین میں جبر نہیں

حق تعالیٰ شانہ، فرماتے ہیں: لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ [۱]

دین میں جبر نہیں ہے۔ جب توحید سامنے آگئی تو کسی کو زبردستی نہیں منوایا جائے گا بلکہ اسے خود ماننا پڑے گا۔ مسلمان ہونا ہی پڑے گا، کافر رہ نہیں سکتا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ سمجھانے کا کام ہے اگر ماننا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ مرضی ہے۔ مگر یہ صرف یہاں کے عمل کے اعتبار سے ہے، انجام کے اعتبار سے آدمی کے بس میں نہیں ہے۔

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ

جو آدمی چاہے ایمان کو اختیار کرے اور جو چاہے کفر کو اختیار کرے۔

إِنَّآ أَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِينَ نَارًا. [۲]

بلکہ اتنی بات طے ہے کہ ہم نے ظالموں کے لیے آگ تیار کر رکھی ہے، جو کفر کرے گا وہ آگ میں جائے گا لیکن یہاں کسی کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔

اگر انسانوں کو اسلام کے قبول کرنے پر مجبور کیا جائے تو پھر امتحان کا مقصود ختم ہو جاتا ہے۔ امتحان میں اختیار ہے کہ آپ پرچے میں کچھ لکھیں یا نہ لکھیں۔ اگر لکھنا ہی پڑے گا تو اس کو امتحان نہیں کہتے۔ اور انسان ایسی مخلوق ہے جس کے تابع جنات ہیں۔ انسانوں میں مرد اصل ہیں عورتیں اُن کے تابع ہیں اور پھر مرد اور عورت کے بعد جنات ہیں۔ انسان اور جن

۱: البقرۃ:۲۵۶۔ ۲: الکہف:۲۹۔

ایسے ہیں جن کو اختیار کے ساتھ آزمایا جارہا ہے۔ ان کے علاوہ تمام مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے کام پر مجبور کیا ہوا ہے وہ اس کے خلاف نہیں کر سکتی۔

انسان اور جنات ہی مختار ہیں

سورج بھی ہماری طرح ایک مخلوق ہے لیکن اس کو اختیار نہیں دیا گیا کہ اِدھر سے نکلے یا اُدھر سے نکلے، نکلتا ہے تو ٹھیک ہے اگر نہیں نکلتا تو سو جائے ایسا نہیں ہے، اُسے نکلنا ہی پڑے گا۔ چاند کے لیے وہی نظام ہے، پانی کے لیے وہی نظام ہے، ہواؤں کے لیے وہی نظام ہے، پہاڑوں کے لیے وہی نظام ہے، آسمانوں کے لیے وہی نظام ہے، انسان و جنات کے علاوہ پوری کی پوری مخلوق حق تعالیٰ شانہ، کی مطیع اور فرمانبردار ہے اور جس کام پر اللہ تعالیٰ نے لگا دیا ہے وہ وہی کام کر رہی ہے۔

اطاعت اور عبدیت میں فرق

اللہ تعالیٰ انسان سے یہ چاہتے ہیں کہ تو اپنے اختیار سے میری بات مان لے۔ انسان کے اندر عبودیت ہے۔ دوسری مخلوقات مطیع تو ہے لیکن عبد نہیں ہے۔ مطیع نوکر کو کہتے ہیں بایں معنی اس کا ایک کام ہوتا ہے، جو کام اُس کو دے دیا گیا بس وہی کام کرنا ہے اس کے خلاف نہیں۔ جو غلام ہوتا ہے اُس کا کام مقرر نہیں ہوتا، اُس کو کوئی بھی کام کہا جاسکتا ہے۔ ابھی جھاڑو دے دو، ابھی فلاں چیز لے کر آؤ، ابھی کار صاف کر دو۔ انسانوں کا بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ حج کے موقع پر حج کے لیۓ جاؤ، رمضان کا مہینہ آگیا ہے لہٰذا روزہ رکھو، نماز کا وقت ہے تو نماز پڑھو، کمانے کا وقت آگیا تو کمالو، شادی کی ضرورت پڑ گئی تو شادی کر لو، عبدیت میں اپنی طرف سے نہیں چلانا ہے۔ آدمی عبدیت میں پوری طرح تابع ہوتا ہے، اطاعت میں صرف یہ ہوتا ہے کہ ایک کام لگا دیا جائے اور وہی کرنا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ، نے جن و انس کے علاوہ

پوری مخلوق کے لیے یہ نظام رکھا ہے کہ وہ اُس کام کو کرنے میں مجبور ہے جس کے لیے اُس کو پیدا کیا گیا، اسی لیے اُس کے ساتھ امتحان کا معاملہ نہیں ہے اور اس کے ساتھ جنت و جہنم کا کوئی نظام نہیں ہے۔ سورج اور چاند کے لیے جنت اور جہنم کا مسئلہ نہیں ہے کہ تم اتنے کروڑ سال سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں لگے ہوئے ہو اور جو کام تمہارے ذمہ دیا گیا وہ کام تم کر رہے ہو لہٰذا سورج اور چاند کو بھی ایک ایک جنت دی جائے گی، ایسی کوئی بات نہیں ہے، چاند و سورج کے لیے نہ جنت ہے اور نہ جہنم ہے۔ حتیٰ کہ فرشتوں کے لیے بھی نہ جنت ہے اور نہ جہنم ہے حالانکہ فرشتے انسانوں سے بہت پہلے سے عبادت کر رہے ہیں اور بہت زیادہ کر رہے ہیں۔ اُن کے مزاج میں نافرمانی نہیں ہے، جب نافرمانی نہیں ہے تو امتحان نہیں ہے، جب امتحان نہیں تو پھر انعام کس بات کا؟ جب امتحان نہیں تو پھر مصیبت کس بات کی؟ تمام چیزیں امتحان پر موقوف ہیں۔

انجام میں کسی کو اختیار نہیں

جتنے لوگ یہاں بیٹھے ہیں سب یہی کہتے ہیں کہ میں مجبور ہوں۔ اگر آپ نہیں جائیں گے تو کیا آپ کی ٹانگ کاٹی جائے گی؟ یا آپ کو جیل میں ڈال دیا جائے گا؟ ایسی کوئی بات نہیں ہے بلکہ سب مجبور ہیں۔ کل اور پرسوں تو چھٹی ہے لیکن پیر کے دن میں مجبور ہوں، حالانکہ کوئی آپ کو کچھ نہیں کہہ رہا لیکن پھر بھی آپ مجبور ہیں۔ انجام میں کسی کو اختیار نہیں ہے۔ آدمی جاب (Job) پر نہ جانے سے جاب باقی نہ رہنے کا انجام سامنے رکھ کر اپنے کو مجبور بتاتا ہے حالانکہ کوئی اس کی ٹانگ پکڑ کر نہیں کھینچ رہا ہے۔ بالکل یہی حال دنیا میں ہے۔ آدمی اسلام لانے میں یا کفر اختیار کرنے میں اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے میں یا فسق و فجور کرنے میں، اپنے آپ کو خواہشات پر یا اللہ تعالیٰ اور نبی پاک صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے احکامات پر چلانے میں

خود مختار ہے لیکن جو انجام سامنے آنے والا ہے آدمی اُس میں مختار نہیں ہے، اسی وجہ سے وہ مجبور ہے۔ اس لیے فرمایا:

فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ

جو چاہے ایمان کو اختیار کرے اور جو چاہے کفر کو اختیار کرے۔

اب کوئی قرآن پاک کا اتنا حصہ لے لے اور یہ کہے کہ اللہ کی مرضی ہے ہم جو چاہیں کریں، جس کی مرضی ہے ایمان اختیار کرے اور جس کی مرضی ہے کفر اختیار کرے۔ اس کے بعد والی بات کو سمجھانے کے لیے فرمایا:

إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا

ہم نے کافروں کے لیے آگ تیار کر رکھی ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ اپنے اختیار سے جہنم کو اختیار کر رہا ہے لہٰذا وہ آگ میں جارہا ہے۔ اس لیے فرمایا:

''لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ'' دین میں زبردستی نہیں ہے۔

"لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ" کا شان نزول

اسلام سے پہلے مشرکین، یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنے سے زیادہ اچھے مذہب پر سمجھتے تھے۔ مشرکین اپنے مقابلے میں یہودیوں اور عیسائیوں کو ترجیح دیتے تھے کہ وہ لوگ آسمانی کتاب رکھتے ہیں اور ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا تھا مثلاً کسی عورت کے بچے مسلسل مر رہے ہیں۔ وہ عورت منت مانتی کہ اگر اب میرے بچے زندہ رہے تو میں اُن کو نصرانی بنادوں گی، بڑا مذہب ہونے کے ناطے میں اُن کے حوالے کر دوں گی۔ چنانچہ ایک عورت نے ایسا ہی کیا، جب یہ بچے بڑے ہو گئے تو اُن کو عیسائیوں کے حوالے کر دیا۔ حضور پاک ﷺ تشریف لائے تو اسلام آگیا اور وہ عورت بھی مسلمان ہو گئی۔ لیکن جب خیبر کے

یہودیوں کو جلاوطن کیا گیا تو اس موقع پر ان لوگوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ ہم اپنے بچوں کو عیسائیت پر نہیں رہنے دیں گے اور ان کے ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔[1] تب یہ آیت نازل ہوئی اور فرمایا کہ تم کو جبر کرنے کا حق نہیں ہے۔ اگر وہ اسلام کو قبول کرنا چاہیں تو ٹھیک ہے ورنہ اُن کی مرضی ہے، اب وہ بڑے ہو چکے ہیں۔

اور بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ جب خیبر کے یہود جلاوطن کیے گئے تو اسی طرح کچھ لوگ اپنے بچوں کو یہودیوں کے حوالے کر چکے تھے۔ اس موقع پر ان لوگوں نے اپنے بچوں کو اسلام میں لانا چاہا، یہ مسئلہ بھی حضور ﷺ کے سامنے آیا تو آپ ﷺ پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی اور یہ بتایا گیا کہ دین میں جبر نہیں ہے۔ اُن کو سمجھاؤ اگر وہ اپنی خوشی سے اسلام کو قبول کرتے ہیں تو اُن کی مرضی ہے اور اگر یہودی یا عیسائی ہی رہنا چاہتے ہیں تو اُن کو اُن کے حال پر چھوڑ دو۔

بعض مفسّرین نے کہا ہے کہ یہ آیت اس موقع پر نازل ہوئی جب ایک انصاری صحابی (جن کا نام حصینی تھا) کے دو لڑکے عیسائی بنا دیے گئے تھے، وہ اس طرح سے کہ شام کے نصرانی تاجروں نے جن کا زیتون کا کاروبار تھا ان کو نصرانیت کی دعوت دی، تو انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ اور ان کے ساتھ جانے کا ارادہ کر لیا تو ان کی والد نے منع کیا اور ان کو زبردستی روکنے لگے اور آپ ﷺ سے درخواست کی کہ ان کو روکیں آپ ﷺ فرمایا کہ انہیں سمجھاؤ اگر وہ اسلام قبول کرتے ہیں تو ٹھیک ہے اور اگر اسلام قبول نہیں کرتے ہیں تو انہیں جانے دو۔ انہوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا میں اس بات کو گوارا کروں کہ میرے جسم کا کچھ حصہ جہنم میں جائے (کیونکہ حضور ﷺ بتا چکے تھے کہ جو

---

[1]: تفسیر ابن کثیر: ۱ / ۶۸۲)

عیسائیت یا یہودیت پر مرے گا وہ جہنم میں جائے گا) آپ ﷺ نے یہی فرمایا کہ زبردستی نہیں ہے، بچے اپنے اختیار سے جارہے ہیں لہٰذا تمہارے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں رہی۔ [1]

اسلام میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ یعنی دنیا میں اسلام کو قبول کرنے کے لیے جبری نظام نہیں ہے۔ جس چیز کی وضاحت مکمل نہیں ہوتی اُس پر آدمی کو جبر کیا جاتا ہے اور اس کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔

جبر کا محل

اسلام کی بنیادی چیزوں میں سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور حضور ﷺ کی رسالت ہے، جب اسلام کی حقانیت دلائل سے واضح ہے تو پھر اسلام میں زبردستی نہیں ہوسکتی۔ جس چیز کا اپنی ذات پر حق نہیں ہے اور جس چیز پر لوگوں کو قائل نہیں کیا جاسکتا، جس کو لوگ نہیں مانتے وہاں پر زبردستی چلتی ہے۔ جیسے کوئی حکومت کا ذمہ دار ہے اور کوئی نظام لاگو کرنا چاہتا ہے، عوام نہیں مان رہی تو یہ زبردستی کرے گا کہ اس قانون کو مانو ورنہ سزا نافذ کروادوں گا۔ ایسی جگہ پر زور زبردستی چلتی ہے۔ اسلام میں زبردستی نہیں ہے۔

اسلام میں جبر نہ ہونے کی وجہ

ویسے بھی اسلام میں زبردستی نہ ہونے پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اسلام کا محل یا جگہ دل ہے اور دل پر جبر نہیں کیا جاسکتا۔ اگر دل پر جبر کیا گیا اور آدمی زبان سے اسلام لے آیا تو بھی مسلمان نہیں ہوتا۔ منافقین خود کو مسلمان ظاہر کرتے تھے لیکن دل سے مسلمان نہیں

---

[1] تفسیرِ نسفی: ۱ / ۱۳۰۔

تھے۔ کیونکہ اسلام و ایمان کا محل دل ہے اور دل پر کسی کا زور نہیں چل سکتا، اسی لیے کسی کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا جاسکتا۔

''لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ'' کے بارے میں ایک ضابطہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ دنیا دھوکے کی جگہ ہے۔ اسلام نے اعلان کیا کہ دین میں زبردستی نہیں ہے۔ یہ "زبردستی" کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟ کسی چیز پر جبر کیونکر ہوتا ہے؟ جو بات واضح نہیں ہوتی اُس میں زبردستی منوایا جاتا ہے اور اُس وقت زبردستی کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ چونکہ دین اپنے دلائل کی وجہ سے بالکل واضح ہے اس لیے اس میں زبردستی کی گنجائش ہی نہیں ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ دین کا اصلاً تعلق دل سے ہے اور آدمی کسی کے دل پر جبر نہیں کرسکتا۔ جب سے شریعت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی بھیجے تو ہمیشہ ایسا ہوا کہ اسلام لانے والوں پر جبر کیا گیا کہ تم اسلام کو چھوڑو۔ ایمان لانے والوں پر جبر کیا گیا کہ تم ایمان کو چھوڑو۔ کسی پر ایمان لانے کے لیے جبر نہیں کیا گیا کہ تم ایمان لاؤ۔ انسانیت کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ اسلام لانے پر جبر نہیں کیا گیا بلکہ اسلام کو چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ اگر چور کوتوال کو ڈانٹنا شروع کردے تو کوتوال سوچتا ہے کہ شاید اس نے چوری نہیں کی، اسی وجہ سے اتنی جرأت کررہا ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ چور اپنی چوری چھپانے کے لیے دوسروں کو چور کہنا شروع کردیتا ہے۔

جیب کترے کا واقعہ

میں نے اپنی آنکھوں سے بڑا عجیب و غریب واقعہ دیکھا۔ ہم لوگ تاج محل دیکھنے کے لیے آگرہ گئے تھے۔ وہاں پر سیاح اور مالدار لوگ آتے رہتے ہیں تو اُچکے اور جیب کترے بھی ہوتے ہیں۔ بس میں کسی کی جیب کاٹ دی گئی۔ جب اُس کو پتہ چلا تو اُس نے یکدم شور مچادیا۔ بس تو رُکی نہیں تھی، اتنی بات طے ہوگئی کہ چور بس ہی میں ہے۔ جیسے ہی بس رُکی لوگ نیچے

اُترے اور نیچے اُترتے ہی ایک آدمی نے بھاگنا شروع کر دیا۔ اُس کے پیچھے دوسرا اور تیسرا بھی بھاگنے لگا۔ جو تیسرا سب سے پیچھے بھاگ رہا تھا اُس نے شور مچانا شروع کر دیا کہ چور چور! پکڑو!۔ تیسرے کے کہنے کی وجہ سے اب سب لوگ آگے بھاگنے والوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ اتفاق سے جب وہ آگے بھاگنے والے دونوں مل گئے تو اُن کی تلاشی لی گئی، اُن کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اتنی دیر میں تیسرا بھاگ گیا جس نے چور چور کا شور مچایا تھا لیکن وہ اتنی تیز نہیں بھاگ سکا تھا کہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ لوگ اُس کے پیچھے بھاگے۔ بالآخر اُس کو پکڑ لیا گیا، اُس کی جیب سے سب کچھ بر آمد ہو گیا اور اُس کی پٹائی کی۔ چور نے یہ راز سمجھ لیا کہ جب میں دوسرے کے بارے میں شور مچاؤں گا تو فی الحال کوئی میرے بارے میں نہیں سوچے گا کہ میں حقیقی چور ہوں۔

غیر مسلموں کا اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ

پوری دنیا میں یہودی، عیسائی، مشرک، ہندو، بدھ مت وغیرہ اسلام کے بارے میں بات کرتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، اسلام میں زبردستی کی گئی ہے۔ جب بھی اسلام آیا اور اس کی محنت آئی تو یہ سب لوگ اپنے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اس طرح کی بات کرتے ہیں۔ یہ ہمیشہ کا ضابطہ ہے۔ اسلام کے خلاف یہ پرانا پروپیگنڈہ ہے اور شروع سے اسلام کے بارے میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اسلام زور سے پھیلا، زبردستی سے پھیلا، طاقت اور تلوار کے زور سے پھیلا۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ ہمیشہ اسلام کے خلاف زبردستی کی گئی ہے۔ اسلام لانے والوں پر اسلام نہ لانے والوں نے ہمیشہ زبردستی کی ہے۔ یہ اسلام کی تاریخ ہے۔ اس بارے میں تاریخ چھپی ہوئی نہیں ہے۔

ایک مرتبہ حضور ﷺ کے سامنے حضراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے دُشمنوں کی زیادتی کا ذکر کیا تو فرمایا کہ تم تو جلدی کر رہے ہو، تم سے پہلے والوں کے ساتھ ایسا ہوا کہ لوہے کی کنگیوں کے ذریعہ اُن کے گوشت کی بوٹیاں بنائی گئی، کسی کے تن پر آرا چلایا گیا۔[۱] اور زیادتی اس طرح بھی کی گئی کہ کسی کو زندہ آگ میں ڈال دیا گیا۔[۲] کسی کو چت لٹا کر ہاتھ اور سینے میں کیلیں ٹھونک دی گئیں۔ جیسا کہ فرعون کی بیوی حضرت آسیہ کے بارے میں مشہور ہے۔[۳] ہمیشہ یہ ظلم و زیادتی اسلام لانے والوں پر، اسلام نہ لانے والوں کی ہے تا کہ وہ لوگ اسلام کو چھوڑیں۔

حضور ﷺ سے پہلے کی یہ تاریخ ہے کہ جب بھی نبی آتے اور اسلام کی دعوت دیتے تو نبیوں کے ساتھ اور نبیوں پر ایمان لانے والوں پر ظلم و زیادتی اور زبردستی ہوتی کہ اسے چھوڑ دو۔ اسلام چھوڑنے پر کفر نے ہمیشہ زبردستی کی۔

جب یہ سارے واقعات بعد میں آنے والوں کے سامنے آتے ہیں تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یقیناً اسلام میں جان ہے جس کی وجہ سے ان لوگوں نے اتنی تکالیف برداشت کیں۔ اس سے قبل کوئی دوسرا آدمی کہے یہ کفار اپنی طرف سے کہہ دیتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، اسلام زبردستی پھیلایا گیا ہے، اسلام جبر کے ساتھ پھیلایا گیا ہے۔ ہمیشہ اسلام کو چھوڑنے پر جبر کیا گیا، آپ یہ قاعدہ یاد رکھ لیجیے اور پوری تاریخ اس پر گواہ ہے۔

قرآن پاک میں اس کا بیان ہے:

قُتِلَ أَصۡحَابُ الۡأُخۡدُودِ، النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُودِ، إِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُودٌ، وَهُمۡ عَلَىٰ مَا يَفۡعَلُونَ بِالۡمُؤۡمِنِينَ شُهُودٌ[۴]

۱: صحیح البخاری:۳۴۱۶۔ ۲: صحیح مسلم:۷۷۰۳۔ ۳: تفسیر ابنِ کثیر: ۸ / ۳۸۷۔ ۴: البروج:۴ تا ۷۔

وہ الاوے والے قتل ہوں اور اُن کا ناس ہو کہ انہوں نے بہت بڑا آگ کا اَلاوا بنایا اور اُس کے اطراف میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے، اس کے بعد وہ ایمان والوں کو ایک ایک کر کے آگ میں ڈالتے تھے اور اُن کے جلنے بھنے کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔

وَهُمۡ عَلَىٰ مَا يَفۡعَلُونَ بِٱلۡمُؤۡمِنِينَ شُهُودٌ

جو کچھ ایمان والوں کے ساتھ کر رہے تھے وہ خود اُس وقت میں موجود دیکھ رہے تھے۔

وَمَا نَقَمُوا مِنۡهُمۡ إِلَّآ أَن يُؤۡمِنُوا بِٱللَّهِ ٱلۡعَزِيزِ ٱلۡحَمِيدِ

اس آگ میں جلنے والوں کا قصور یہ تھا کہ وہ اللہ عزیز و حمید پر ایمان لائے تھے اور کوئی ان کا قصور نہیں تھا۔

آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو ایذارسانی

حضور پاک صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی ذاتِ گرامی کو دیکھ لیجیے۔ جیسے ہی آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے اسلام کا اظہار فرمایا، خود سرکارِ دوعالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے ساتھ کیا کیا واقعات پیش نہیں آئے۔ کیا یہ زبردستی اور جبر نہیں ہے؟ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو نماز نہ پڑھنے دینا۔ جب یہ نماز پڑھیں تو ان کے اوپر اوجھڑی لا کر ڈال دینا۔[1] چھپ چھپ کر کیوں نماز پڑھتے تھے، دارِ اَرقم میں کیوں چھپے رہتے تھے، اسی مجبوری کی وجہ سے۔ ایک مرتبہ حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک کافر عقبہ ابنِ ابی معیط آیا اور اُس نے اپنی چادر کو رَسی کی طرح سے لپیٹ دیا۔ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے سجدے میں جانے پر اُس نے رَسی گلے میں ڈال دی اور اُس کو بَل دینا شروع کر دیا یہاں تک کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی زبان مبارک باہر آگئی۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آئے اور اس کو ہٹایا۔[2] ورنہ اُس نے تو تہیہ کر لیا تھا کہ اس طرح آپ کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے دروازے پر کانٹوں کو

۱: صحیح البخاری: ۳۱۸۵۔ ۲: صحیح البخاری: ۱ / ۳۶۷۸۔

بچھا دینا[۱] اور آپ کے گھر کے اوپر گندگی پھینک دینا۔[۲] ان تمام باتوں کا مطلب یہی جبر تو ہے کہ آپ ﷺ جو کچھ کر رہے ہیں اُسے چھوڑ دیں۔

ایسی حرکتوں سے آدمی کی یکسوئی میں فرق پڑ جاتا ہے اور ذہنی تکلیف الگ ہوتی ہے، حضور ﷺ صرف یہی فرماتے تھے کہ اے عبد مناف! پڑوسیوں کا حق خوب ادا کرو۔[۳] اس سے زیادہ کچھ نہیں فرماتے تھے، اور نہ اُلجھتے تھے۔

آپ ﷺ کے ساتھ جو واقعات پیش آئے ہیں اُنہیں ہم اپنے مذاکرے میں سنتے رہتے ہیں کہ ابتدائی طور پر مسلمانوں کو کیسی کیسی مشقتیں اور قربانیاں جھیلنی پڑیں۔ ابتداء میں پچیس مشرکین کی ایک جماعت تھی جس کا کام صرف یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے کے لیے منصوبے بناتے اور نئے نئے راستے لوگوں کو سجھاتے، اس جماعت کا سردار ابولہب تھا۔ قاضی سلیمان صاحب کی سیرت کی کتاب "رحمۃ اللعالمین" میں اس کی تھوڑی سی تفصیل ملے گی۔ ان کی گروپ میٹنگ کے بعد حضور ﷺ کے ساتھ بائیکاٹ کا قصہ پیش آیا تھا۔ تین سال شعب ابی طالب (ابو طالب کی گھاٹی) میں حضور ﷺ اور اُن کے خاندان کو رہنا پڑا۔ اُن کے ساتھ نہ کوئی خرید و فروخت کرتا، نہ اُنہیں اپنی دُکان میں آنے دیتا، نہ کھانے کی کوئی چیز خرید سکتے تھے اور نہ پہننے کی، نہ قافلے والوں سے ملنے کی اجازت تھی اور نہ بات کرنے کی اجازت تھی۔ جتنے لوگ حضور ﷺ پر ایمان لانے والے تھے اور جو حضور ﷺ کے خاندان والے تھے جن میں بعض مسلمان بھی نہیں تھے۔ جیسے ابو طالب تو وہ بھی شعب ابی طالب میں محصور رہے۔ جو قبیلہ حضور ﷺ کا خاندانی لحاظ سے ساتھ دے رہا تھا اُن لوگوں کے ساتھ بھی بائیکاٹ کیا گیا اور ایک دن دو دن، ایک مہینہ دو مہینہ، چھ مہینہ اور

۱: روح المعانی: ۲۳ / ۱۷۴۔ ۲: تاریخِ طبری: ۱ / ۵۵۳۔ ۳: سیرت ابنِ ہشام: ۲ / ۲۶۳۔

سال نہیں بلکہ مکمل تین سال اس بائیکاٹ پر گزر گئے۔ اس دوران درختوں کے پتوں اور چھالوں پر گزارہ کرنا پڑا۔ حضور ﷺ کو جو تکلیف تھی وہ اپنی جگہ پر تھی لیکن حضور ﷺ کی اصل تکلیف یہ تھی کہ آپ ﷺ سے دوسروں کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی تھی۔ قبیلے اور خاندان کی عورتوں کے جسم خشک ہو گئے تھے کہ اُنہیں چھوٹے بچوں کو دودھ پلانے کا موقع ہی نہیں تھا۔ یہ سب حالات مشرکین کو معلوم تھے اور وہ یہ سب اسی لیے کر رہے تھے کہ مسلمان اسلام کو چھوڑ دیں یا اسی تکلیف میں مر جائیں۔

بالآخر حضور ﷺ کے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے اور یہ اطلاع دی کہ ان لوگوں سے کہہ دیں کہ جو تم لوگوں نے بائیکاٹ کا معاہدہ کیا اور اُسے خانہ کعبہ میں لٹکایا ہے اُس کو دیمک نے چاٹ لیا اب یہ معاہدہ باقی نہیں رہا۔ حضور ﷺ نے یہ کہلوا بھیجا۔ چنانچہ یہ لوگ خانہ کعبہ پر پہنچے اور دیکھا کہ پورے معاہدے کو دیمک چاٹ چکی تھی تب وہ معاہدہ برخاست ہوا اور مسلمان شعب ابی طالب سے نکلے۔[۱] شعب ابی طالب پہاڑیوں کے درمیان ابوطالب کے بکریوں کی چرنے کی جگہ تھی وہاں پر مسلمانوں کو محصور کیا گیا تھا کہ وہ لوگ گھر بھی نہیں جاسکتے اور خرید و فروخت بھی نہیں کرسکتے۔ اس مدت کے دوران کیا کیا مسائل جھیلے گئے؟ اور کیسے کیسے ظلم و زیادتیاں کی گئیں؟ یہ سب ناقابل بیان ہیں اور نہ سب کچھ بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ مصیبتوں کو اللہ کی خاطر جھیلتے تھے اس لئے بیان نہیں کرتے تھے۔

تعذیبِ مسلمین صحابہ سے زیادہ حضور ﷺ پر گراں

جتنے واقعات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ پیش آئے، وہ تمام واقعات صحابہ کے ساتھ جبر کے تھے، اس سے کہیں زیادہ وہ حضور ﷺ کو تکلیف پہنچانے کے لیے تھے کہ

---

[۱]: رحمۃ اللعالمین: ۹۱، دلائل النبوۃ: ۲۰۱ و سیرت النبی: ۱ / ۱۵۳۔

آپ ﷺ کا رقیق اور گداز دل برداشت نہ کرسکے اور آپ ﷺ اپنے کام کو چھوڑ دیں۔ ان لوگوں نے صحابہ کے ساتھ جتنی زیادتیاں کیں، وہ صحابہ سے زیادہ حضور ﷺ پر گراں تھیں چونکہ صحابہ جتنے اپنے بارے میں ہمدرد تھے، حضور ﷺ اِس سے زیادہ اُن کے بارے میں ہمدرد تھے اور آپ ﷺ کسی کی تکلیف کو برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ "عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ "[1] جن کو تمہاری مضرت نہایت گراں گزرتی ہے جو تمہاری منفعت کے خواہشمند رہتے ہیں ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں، کفار چاہتے تھے کہ حضور ﷺ ان تکالیف کو نہ دیکھ سکیں اور اپنا کام چھوڑ دیں۔

حضرت بلالؓ پر ظلم

اب صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی داستان کتنی اندوہناک، غمناک اور تکلیف دہ ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا قصہ اکثر سنتے رہتے ہیں کہ اُن کے پیر رَسّی سے باندھ دیے اور اُن کو گھسیٹتے پھر رہے ہیں۔ مناظر احسنؒ گیلانی نے لکھا ہے کہ جب کتّے مر جاتے ہیں تو مہتر پیروں میں رَسّی ڈال کر گھسیٹتے ہیں، یہاں (ظالموں کا سلوک یہ ہے کہ) زندہ انسانوں کے پیروں میں رَسّی ڈال کر اُن کو گھسیٹا گیا ہے۔ قریش میں بھی ایسے کتّا صفت انسان تھے۔ ایک آدمی زندہ ہے، اُس کے پیروں میں رَسّی ڈال کر شرارتی بچوں کے حوالے کر دیا کہ اس کو گلیوں میں گھسیٹو۔[2] ایسے موقع پر پیٹھ کا کیا حال ہوتا ہے، چہرے کا کیا حال ہوتا ہے۔ گرم ریت اور اَنگاروں پر لٹایا جارہا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کتنے مہذب اور شائستہ آدمی تھے، جب

---

[1]: توبہ: ۱۲۸۔ [2]: سیرت النبی لابن کثیر: ۱ / ۴۹۴۔

اُن کے چچا کو معلوم ہوا تو وہ اُنہیں چٹائی میں لپیٹ دیتا تھا اور ایک طرف سے دھواں دیتا تھا۔ یہی تو جبر ہے کہ تم اسلام کو چھوڑ دو۔[۱] یہی تو جبر ہے کہ تم اسلام کو چھوڑ دو۔

حضرت عمارؓ اور دیگر صحابہ پر ظلم

حضرت ابو فکیہہؓ کے سر کے بال چھیلے جاتے تھے جیسے مرغی کے پَر چھیلے جاتے ہیں۔ پھر اُن کے سر پر اَنگارہ رکھا گیا جس سے اُن کے تمام بال جل گئے۔[۲]

حضرت عمارؓ کی والدہ حضرت سمیہؓ کے نازک مقام پر برچھا مار کر ان کر شہید کر دیا گیا اور ان کے والد بھی انہیں مشرکین کی ایذا رسانیوں کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو گئے۔اور حضور پاک ﷺ کو ان ساری چیزوں کا علم تھا اور آپ نے بنفسِ نفیس ان مظالم کو دیکھا تو آپ نے فرمایا کہ عمار! صبر کر لو، تم سے وعدہ کیا جاتا ہے تم کو ضرور جنت ملے گی۔[۳] اِس وقت اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ اس کے جواب میں ہمیں کچھ کرنا نہیں ہے۔

حضور ﷺ کو یہ حکم تھا کہ آپ بس اس وقت صبر کر لیں اور ایمان لانے والوں کو بھی حکم تھا کہ اس وقت برداشت کیا جائے اور مدافعت نہ کی جائے۔ انہی لوگوں نے مدینہ شریف جا کر مدافعت کی، لیکن یہاں اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ تمہیں اپنا ہاتھ نہیں اُٹھانا ہے۔ جو کر رہے ہیں انہیں کرنے دو، مار رہے ہیں تو مارنے دو، دھواں دے رہے ہیں تو دینے دو، پیروں میں رَسّی ڈال کر گھسیٹ رہے ہیں تو گھسیٹنے دو، آگ پر لٹا رہے ہیں تو لیٹ جاؤ، گرم گرم پتھر کی سلیں سینے پر رکھ رہے ہیں رکھنے دو۔

۱: العہد المکّی: ۱ / ۵۔ اکثر کتب تاریخ میں یہ واقعہ حضرت زبیر کے متعلق مذکور ہے۔ ۲: سیرتِ حلبیہ: ۱ / ۴۸۱۔ ۳: سیرت النبی لابن کثیر: ۱ / ۴۹۴۔

حضرت خباب رضی اللہ عنہ کو اَنگاروں پر لٹادیا جاتا تھا اور اُن کی پیٹھ کے جلنے سے جو خون اور چربی نکلتی تھی اُس سے وہ اَنگارے بجھتے تھے۔[1] یہ جبر نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ یہ سب کچھ اس لیے بیان کیا گیا ہے تاکہ اس کا استحضار رہے کہ ہمیشہ اسلام چھوڑنے پر مجبور کیا گیا ہے اور اسلام لانے پر کبھی مجبور نہیں کیا گیا۔

اسلام اور ایمان کا محل

غرض یہ اپنی جگہ حقیقت ہے کہ اسلام اور ایمان کا تعلق دل سے ہے۔ حق تعالیٰ شانہ، نے اسلام اور ایمان کے بارے میں دلائل کے ذریعے سے انسان کی عقل اور ضمیر پر یہ بات واضح کی ہے اور اس کے دل کو متوجہ کیا ہے۔ مار کے ذریعے سے کسی کو اسلام کی طرف نہیں بلایا گیا ہے حتیٰ کہ اس کا شانِ نزول خود بتارہا ہے کہ ایک مسلمان گھرانے کے دو بچے جبکہ وہ نصرانی ہوچکے تھے اور والدین اس بات پر قادر تھے کہ اپنے پاس بچوں کو روک کر مسلمان بنائیں، حضور پاک صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے منع فرمادیا کہ اسلام میں اس کی گنجائش نہیں، چونکہ وہ سمجھ دار ہیں، تم اُن کو سمجھاؤ، ہاں اگر وہ مان لیں تو ٹھیک ہے۔ سمجھانے کا نام جبر نہیں ہے مگر کسی کو زبردستی مسلمان بنایا جائے، اس بات کو شروع ہی سے روکا گیا ہے۔

یہاں ایک یہ بات یاد رکھنے کی ہے۔ اس کے ساتھ مزید اور کچھ نکتے ہیں جس میں جہاد کا نظام ہے۔ دیکھنے کے اعتبار سے لوگوں کو جلاوطن کیا گیا اور بہت سی لڑائیاں وجود میں آئیں اور بہت سے لوگ مارے بھی گئے، بظاہر اِن پر تلواریں چلائی گئیں تاکہ یہ مسلمان ہوجائیں۔ عام طور پر اس بات کو دوسرا رنگ دے کر کسی اور طریقے سے پیش کیا جاتا ہے۔ اور اسلام کے نظامِ جہاد سے اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام میں جبر ہے تب ہی تو جہاد کیا جاتا ہے۔

---

[1]: اسد الغابۃ: ۱۴۰۷۔

اصل دعوت یا جہاد؟

اسلام میں اصل چیز دعوت ہے، جہاد نہیں۔ اگر دعوت دینے کا موقع کافی نہیں ہے تو بعض دفعہ لڑنے کی نوبت آجاتی ہے۔ اس کو اس بات سے سمجھ لیجیے کہ آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ کے تیرہ سال میں جہاد نہیں فرمایا، اِس کو قرآن مجید میں یہ کہا گیا ہے کہ آپؐ ان سے جہاد فرمارہے ہیں۔ مکہ کی زندگی کو جہاد ہی کہا گیا۔

وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا [۱]

آپ ان کے ساتھ چھوٹا نہیں بڑا جہاد کیجیے اور یہ آیت مکہ شریف میں اُتری تھی۔ آپ ﷺ کیا جہاد کررہے تھے۔ ایسے حالات میں صبر کرکے انہیں دین کی دعوت دے رہے تھے۔ یہ جہاد ہی تھا۔ یہاں جہاد کو قتال کے معنی میں نہیں لیا گیا، جہاد الگ چیز ہے اور قتال الگ چیز ہے۔ لوگوں کو جنت میں پہنچانے کی کوشش کرنا جہاد ہے اور قتال میں لوگ جہنم میں چلے جاتے ہیں۔ مسلمان جتنے کافروں کو ماریں گے وہ سب جہنم رسید ہوں گے۔ اس لیے اسلام کا موضوع قتال نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے حتی الامکان قتال سے گریز کیا ہے۔ قتال و لڑائی کے حالات ہمیشہ کافروں نے بنائے ہیں اور اس کے باوجود حضور ﷺ نے یہ کوشش فرمائی کہ قتال و لڑائی نہ ہو۔ حضور پاک ﷺ کی تیئس سال کی طویل مدت میں سے دس سال جہاد ہوا۔ دس سال میں ستائیس جنگوں میں حضور پاک ﷺ بنفسِ نفیس تشریف لے گئے۔ [۲]

اسلامی تاریخ میں مقتولین کی تعداد

جنگوں میں اور جنگوں کے علاوہ مسلمانوں اور کافروں کے مرنے کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے ایک ہزار اٹھارہ کی تعداد بتائی ہے اور ہر جنگ کا

۱: الفرقان:۵۲۔ ۲: عمدۃ القاری:۲۶ / ۳۸۰۔

حوالہ دیا ہے کہ فلاں جنگ میں مسلمانوں میں سے اتنے شہید ہوئے اور کافروں میں سے اتنے مرے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کا لکھنے کا ایک مزاج تھا، انہوں نے کہا کہ کتّے! تجھے یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ اسلام تلوار سے پھیلا، یہ تعداد تو اتنی بھی نہیں ہے جو روزانہ نیویارک کی سڑکوں پر موٹروں کے نیچے آجاتے ہیں۔

اسلام کی تاریخ میں مرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ اسلام مارنے کے لیے نہیں آیا بلکہ اس کی طاقت ہی الگ ہے۔ اگر آدمی صحیح اصولوں اور ترتیب کے ساتھ اسلام کی پیروی کرے گا اور دوسروں کو ترغیب دے گا تو اس میں اٹریکشن ہے۔ حضور ﷺ کی دعوت، تعلیم و تعلّم کے حلقے، حضور ﷺ کے طریقے پر لوگوں کے ساتھ سلوک کرنا، ان چار کاموں پر حضور ﷺ نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ایسا مشغول کیا تھا کہ اگر اُمت ان چار کاموں میں حضور ﷺ کا طریقہ اپنائے گی تو لوگ جوق در جوق مسلمان ہوتے رہیں گے۔ اس کی ترتیب ہی خود ایسی ہے کہ اس میں اسلام کی طرف لچک اور اٹریکشن رکھا ہوا ہے۔

اقسامِ جہاد

بعض دفعہ مسلمانوں کو اپنے علاقے میں جان ومال بچانے کے لیے کافروں سے لڑنا پڑتا ہے، وہ جہاد نہیں ہوتا بلکہ جہاد کا حکم ہوتا ہے۔ شہادت دو قسموں کی ہوتی ہے حقیقی شہادت اور حکمی شہادت۔ حقیقی شہادت یہ ہے کہ اللہ کے راستے کے میں قتل کیا گیا، حکمی شہادت یہ ہے کہ کوئی پانی میں ڈوب کر مر گیا، آگ میں جل کر مر گیا، ایسے مرنے والوں کو شہید کا حکم دیا جاتا ہے۔

اسی طرح مسلمانوں اور کافروں کے درمیان زمین کی بنیاد پر جھگڑا شروع ہو گیا یا ویسے ہی مسلمانوں کی کافروں سے لڑائی شروع ہو گئی یا علاقوں کی بنیاد پر مسلمانوں کی مسلمانوں سے

لڑائی ہو گئی، بعض دفعہ اس لڑائی کو بھی جہاد کا حکم دے دیا جاتا ہے، اس کی حفاظت کرنا بھی شرعی اعتبار سے ضروری ہے۔ فلسطین میں مسلمانوں کا یہودیوں کے ساتھ جھگڑا کتنے عرصے سے چل رہا ہے، یہ جہاد ہو رہا ہے۔ افغانستان اور رُوس کا جھگڑا وہ بھی جہاد ہوا، مگر اس میں جہاد کا حکم ہے۔ اسلام میں زمین کے ایک بالشت ٹکڑے کو بچانا بھی فرائض واحکام میں سے ہے۔ اپنے علاقے کو محفوظ کرنا، مسلمانوں کو محفوظ کرنا اور اپنے اوپر آنے والی مصیبت کو دُور کرنا بھی جہاد ہے لیکن وہ حقیقی جہاد نہیں ہے۔ حقیقی جہاد یہ ہے کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے کسی سے لڑنے کی بات کا پیش آجانا۔ دین کی دعوت دینے کے لیے نکلے، اگر وہ اسلام قبول کر لیتے ہیں تو بہت اچھا ہے۔ اگر اسلام کو قبول نہیں کرتے ہیں تو ماتحتی کو قبول کر لیں۔ ماتحتی بھی اسی لیے ہے کہ ابھی اُن لوگوں نے اسلام کو سمجھا نہیں ہے، جس دن وہ اسلام کو سمجھ لیں گے تو وہ خود ہی قبول کریں گے۔ اسلام کو سمجھنے کے لیے اُس کے ماحول کو دیکھنا اور اُس کا تفصیلی مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

نظامِ جزیہ

اسلامی معاشرے کو دیکھنے کا موقع فراہم کرنے کے لیے اسلام نے جزیہ کی بنیاد رکھی ہے۔ اگر آپ جزیہ دے کر رہنا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے، جتنے حقوق مسلمانوں کے ہیں اُتنے حقوق ذمیوں کو بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ اُن کی جان محفوظ، اُن کا مال محفوظ، اُن کی عزت محفوظ، اُن کی جان کا ویسا ہی بدلہ لیا جائے گا جیسے مسلمان کے ناحق خون کا بدلہ لیا جاتا ہے۔

غرض یہ کہ اسلام کے جزیہ کا نظام ہی بتا رہا ہے کہ اسلام کسی کو زبردستی مسلمان کرنے کا حکم نہیں دیتا۔ ورنہ یوں کہا جاتا کہ ان کے ساتھ لڑو اور جو اسلام قبول نہ کرے اُن کو قتل کر دو، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بلکہ اگر کوئی عین لڑائی کے وقت میں اپنی جان بچانے کے لیے

زبان سے کلمہ کا اظہار کر دے اور دل سے مسلمان نہیں ہوا اور اندازہ ہو جائے کہ اس نے جان بچانے کے لیے اسلام قبول کیا ہے، تب بھی مارنے کا حق نہیں ہے۔

جان بچانے کیلئے کلمہ پڑھنے پر بھی امن

ایک صحابی کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا اور انہوں نے اس کافر کو قتل کر دیا۔ جب یہ مسئلہ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے سامنے لایا گیا تو آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اتنے ناراض ہوئے کہ اس سے پہلے کبھی آپ کو اتنا ناراض نہیں دیکھا گیا۔ ایک صحابی نے کہا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میدانِ جنگ گرم تھا، دونوں طرف سے وار چل رہے تھے۔ ایک کافر میرے وار کے نیچے آ گیا تھا تو اُس نے کلمہ پڑھ لیا، میں سمجھا کہ یہ اپنی جان بچانے کے لیے پڑھ رہا ہے، حقیقتاً دل سے نہیں مان رہا ہے۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم یہ سن کر جلال میں آ گئے اور فرمایا کہ تو نے اُس کا سینہ چیر کر دیکھا تھا۔ [۱] قرآن پاک میں کہا گیا کہ اگر کبھی کوئی غیر مسلم میدانِ جنگ میں اپنی جان بچانے کے لیے یہ چال بازی اختیار کرے تو بھی تم اُن کی رعایت کرو۔ [۲] ہدایت دینا ہمارا کام ہے۔

غرض یہ کہ اسلام میں جہاد کا موقع تو آ جاتا ہے اور یہ موقع کسی کے زبردستی لانے سے نہیں آتا بلکہ اگر کسی کو اسلام کی دعوت دی جاتی ہے اور وہ نہ اسلام کو قبول کرتے ہیں اور نہ ماتحتی کو قبول کرتے ہیں تو اس وقت یہ موقع آتا ہے۔ جہاد بھی دوسروں کو اسلام کا موقع فراہم کرنے کے لیے ہے۔ ظاہر ہے کہ جب سامنے والے ماتحتی قبول نہیں کریں گے تو اُس کے بعد والوں کو اسلام کی دعوت دینے کا موقع کہاں سے ملے گا، اسلام میں ایسی صورت میں سامنے والوں کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

اس لیے قرآن پاک میں یہ بات بتادی گئی کہ اسلام میں بالکل بھی زبردستی نہیں ہے۔

۱: صحیح مسلم:۱۵۸۔ ۲: التوبہ:۶۔

ہدایت اور گمراہی

قَدۡ تَّبَیَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَیِّ

واضح ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے۔ ہم نے دلائل کے ذریعے سے عقل و فہم کھولنے کے لیے دونوں چیزیں ہدایت اور گمراہی سامنے رکھ دی ہیں۔ اب اُس کو تسلیم کرنا یا نہیں کرنا آدمی کے اختیار میں ہے۔ ماں باپ اُس کے ساتھ جبر نہیں کر سکتے۔ اس لیے اس سے پہلے جو رسالت کا بیان تھا وہ اس طرح جوڑ دیا گیا ہے، کہ انبیاء کے ذریعہ حق کو اور باطل کو واضح کر دیا گیا ہے دونوں راستے ان کے سامنے موجود ہیں اب ان پر جبر نہیں کیا جا سکتا وہ چاہیں تو ایمان لائیں اور چاہیں تو کفر اختیار کریں۔

فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَیُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ

جو طاغوت یا شیطان کے ساتھ کفر کرے گا اور اللہ پر ایمان رکھے گا فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی

تو اُس نے مضبوط پکڑ لیا مضبوط حلقہ (رسیّ) کو۔

طاغوت کیا ہے؟

طاغوت ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے پر آمادہ کرے چاہے وہ شیطان ہو، چاہے وہ نفس ہو، چاہے اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہو۔ طاغوت ہر اُس سرکش طاقت کو کہتے ہیں جو آدمی کو اللہ کی مخالفت کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ ہر مسلمان کو بھی طاغوت کے ساتھ کفر کرنا پڑتا ہے ورنہ اس کے بغیر وہ پکا مسلمان نہیں ہوتا۔ مسلمان کو شیطان کے ساتھ برسرپیکار ہونا پڑتا ہے اور طاغوت سے بھی کفر کرنا پڑتا ہے۔

دیکھنے میں دو جملے ہیں۔ طاغوت کے ساتھ کفر کرنا اور اللہ پر ایمان لانا، یہ آسان کام نہیں ہے۔ ہر مسلمان اللہ پر ایمان تو لے آتا ہے لیکن طاغوت کے ساتھ میں کفر نہیں کرتا۔ ہم سب اللہ کو مانتے ہیں لیکن طاغوت کے ساتھ میں کفر کرنا ایک مستقل کام ہے۔ آدمی دل سے غیر کا یقین نکال دے، غیر کی موافقت نکال دے، غیر کی اطاعت نکال دے، نہ اُس میں نفس سامنے آئے، نہ شیطان سامنے آئے، نہ بیوی بچے آئیں، نہ معاشرہ آئے، سب کے ساتھ میں کفر کرے تب اللہ پر ایمان آئے گا۔

کلمے میں "لَا" پہلے اور "اِلَّا" بعد میں ہے۔ اسلام نے نفی پہلے سکھلائی اور اثبات بعد میں ہے۔ اللہ پر ایمان کا اثبات بعد میں ہے اور غیروں سے نفی پہلے ہے۔ دل سے غیر کا یقین نکالنا اور دل میں اللہ کا یقین بٹھانا، ایسے ہی طاغوت کا انکار کرنا ہے اور اللہ پر ایمان لانا ہے۔

لہٰذا جو طاغوت یا شیطان کے ساتھ کفر کرے گا اور اللہ پر ایمان رکھے گا تو اُس نے مضبوط پکڑ لیا مضبوط رسّی کو۔

اگر کمزور رَسّی کو مضبوط پکڑا جائے تو کام نہیں چلتا یا مضبوط رَسّی کو کمزوری کے ساتھ پکڑا جائے تو بھی کام نہیں چلتا، اس لیے فرمایا: "اسۡتَمۡسَكَ" اُس نے پکڑا "بِالۡعُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰى" "مضبوط حلقہ (رَسّی) کو۔ یعنی ایمان اختیار کر لینا ایسی چیز ہے کہ اُس نے مضبوط رَسّی کو تھام لیا۔

اسلام کی رَسّی ازل سے مضبوط ہے

اسلام کی رَسّی ازل سے مضبوط ہے، اس کو پکڑنے والے کبھی کمزور پکڑتے ہیں اور کبھی مضبوط پکڑتے ہیں۔ دنیا میں جتنے بھی مسلمان پریشان ہیں، یہ بات نہیں ہے کہ اسلام کمزور ہے اس وجہ سے پریشان ہیں بلکہ مسلمان اسلام کو کمزوری سے پکڑتے ہیں اس وجہ سے پریشان

ہیں۔ اسلام کی رَسّی کو مضبوط پکڑنے کا مطلب یہ ہے کہ طاغوت کے ساتھ کفر کرو اور اللہ پر ایمان لاؤ۔

لَا انْفِصَامَ لَهَا

اُس کو کبھی بھی شکستگی نہیں ہے یا وہ کبھی ٹوٹنے والی نہیں ہے۔ جو دین اور ایمان کو مضبوط پکڑے گا وہ کبھی نہ دنیا میں نقصان اُٹھائے گا اور نہ آخرت میں۔

اگر رَسّی کو نہ پکڑ سکے تو وہ الگ بات ہے مگر جس نے رَسّی کو مضبوط پکڑا وہ رَسّی ٹوٹنے والی نہیں ہے۔ مسلمان اس بات کو نہیں سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کو اُن کا اسلام نفع نہیں دے رہا ہے، یہ وجہ نہیں ہے کہ اسلام مضبوط نہیں ہے بلکہ یہ وجہ ہے کہ وہ لوگ اس اسلام کو مضبوط نہیں پکڑ رہے ہیں۔ قرآن نے بتادیا کہ دین میں شکستگی نہیں ہے۔ آدمی اگر اس کو چھوڑ دے تو اُس کا نفع آدمی کو نہیں ملے گا اور اگر پکڑ لے تو اُس کا نفع لازماً ملے گا اور کبھی بھی اسلام میں نقصان نہیں ہے۔ اسلام سراپا سلامتی کے لیے ہے اور ایمان سراپا امن کے لیے ہے دنیا میں بھی، قبر میں بھی، حشر میں بھی اور حشر کے بعد بھی۔ اسی لئے اس کے نام ہی میں امن اور سلامتی کی جانب اشارہ ہے۔

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ

اور اللہ تعالیٰ سننے والے اور جاننے والے ہیں۔ ایمان کی باتوں کو کون دل سے کہہ رہا ہے اور کون الفاظ سے ادا کر رہا ہے، حق تعالیٰ شانہ، اقوال کو بھی سنتے ہیں اور دلوں کے حال کو بھی خوب جانتے ہیں، ظاہر اور باطن اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے۔

طاغوت سے کنارہ کشی کا ثمرہ

طاغوت کا کام کیا ہے؟ طاغوت کے ساتھ کفر کرنے میں کیا ہو گا؟ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے سے کیا ہو گا؟ اس سے متعلق آگے کی آیات آرہی ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

اللّٰہُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ

اللہ ولی ہے ایمان والوں کا، نکالتا ہے اُن کو ظلمتوں سے نور کی طرف

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ان آیتوں میں جو مضمون ارشاد فرمایا گیا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ ایمان والوں کو اللہ تبارک و تعالیٰ کی دوستی حاصل ہے اور جو بے ایمان ہیں اُن کو شیطان کی دوستی حاصل ہے۔ دوست وہ ہوتا ہے جو اپنے دوست کا ہاتھ پکڑے، حق تعالیٰ اپنی ولایت کے کچھ اثرات و ثمرات بندے کو پہنچاتے ہیں۔ شیطان بھی اپنی دوستی کے اثرات و ثمرات منتقل کرتا ہے۔ اللہ کی ولایت کے اثرات و ثمرات کیا ہیں؟ اور شیطان کی ولایت کے اثرات و ثمرات کیا ہیں؟

ولایتِ باری تعالیٰ کے ثمرات

اس کے بعد والی جو آیت تلاوت کی گئی ہے اس میں یہ مضمون ہے کہ اس طرح کی ولایت کے اثرات و ثمرات کو سمجھانے کے لیے ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ ربّ العزت کی خلت و ولایت حاصل تھی جبکہ نمرود کو شیطان کی ولایت حاصل تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فہم کیسی تھی اور نمرود کی فہم کیسی تھی؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کس طرح کا نور حاصل تھا اور نمرود کس طرح کی ظلمت میں مبتلا تھا؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ولایت کا ثمرہ نور کا حاصل ہونا ہے جبکہ شیطان کی ولایت کا ثمرہ ظلمت کا حاصل ہونا ہے۔ ظلمت سے کیا مراد ہے؟ اندھیرے کو تو ظلمت نہیں کہتے؟ کہیں کوئی ایسا نہ سمجھ لے کہ ظلمت سے مراد اندھیرا ہے اور نور سے مراد روشنی و اُجالا ہے۔ پورے امریکا والے نور ہی نور میں ہیں اور جن لوگوں کے پاس روشنی نہیں ہے وہ لوگ ظلمت میں ہیں۔ اللہ کی ولایت والا نور بتانے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بیان

کیا گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقابلے میں نمرود تھا، اس کے پاس کیسی ظلمت پائی جاتی تھی اس کو نمرود کے مبہوت ہونے کے واقعہ کے ذریعہ سے بتایا گیا۔

اللہ پاک اہلِ ایمان کے ولی ہیں

اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو خوشخبری سنائی کہ اللہ تعالیٰ تمام ایمان والوں کا ولی ہے۔ اس کو ولایتِ عامہ کہتے ہیں۔ اس میں یہ بات بتادی گئی ہے کہ آدمی یہ سوچے کہ میں ولی اللہ نہیں ہو سکتا، یہ بات غلط ہے۔ لوگ اس طرح کہتے ہیں کہ ہم کہاں ولی ہو سکتے ہیں؟ ہم تو دنیا دار ہیں وغیرہ۔ آدمی دو صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں رہتا ہے ولی اللہ یا ولی الشیطان، اس کے علاوہ تیسری کوئی صورت نہیں ہے۔ جو بھی ایمان والا ہے اُس کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ولایت ہوتی ہے۔ اولیاء اللہ ولایتِ خاصہ کے حامل ہوتے ہیں۔ اِس کی میں کسی اور دن وضاحت کروں گا کہ عام لوگوں کی ولایت میں اور ہمارے پاس جو اولیاء اللہ مشہور ہیں اُن کی ولایت میں کیا فرق ہے؟ ظاہر ہے کہ اولیاء اللہ تو اولیاء اللہ ہیں، اُن کا بڑا مرتبہ اور بڑا مقام ہے، ہم کس شمار میں آئیں گے۔ مگر اولیاء اللہ کی آڑ بنا کر خود کا دنیا میں کھپنا اور گناہوں کے کرنے اور بد دینی اور فسق وفجور کے راستے کو پیدا کر لینا غلط ہے۔ آدمی اللہ کا رہے گا یا غیر اللہ کا رہے گا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ جو ایمان والے ہیں وہ اللہ کے ہیں اور جو بے ایمان ہیں وہ اللہ کے نہیں ہیں۔

ایمان والے ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اُن کے ناصر ہیں، اُن کے مددگار ہیں، اُن کے دوست ہیں تو پھر دوست دوست کی مدد کرے گا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے ساتھ ضابطہ بالکل الگ رکھتے ہیں اور بے ایمانوں کے ساتھ ضابطہ بالکل الگ رکھتے ہیں۔ بہت کم مسلمان اس حقیقت کی طرف توجہ دیتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ، نے مسلمانوں کے لیے الگ

راستہ رکھا ہے اور غیر مسلموں کے لیے الگ راستہ رکھا ہے۔ اگر مسلمان بے دینی کریں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں نہیں چھوڑیں گے۔ اگر غیر مسلم بے دینی کریں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں ڈھیل دیں گے۔ مسلمان اس کو سمجھتے نہیں ہیں۔ اگر اس کو سمجھتے بھی ہیں تو اس پر دھیان دینا نہیں چاہتے۔ جس طرح اس کو اہمیت دینی چاہیے ویسی اہمیت نہیں دیتے۔ یہی سمجھتے ہیں کہ جس میں اُن کی ترقی ہے اُسی میں ہماری ترقی ہے، جس میں اُن کی عزت ہے اُسی میں ہماری عزت ہے، جس میں اُن کی بھلائی ہے اُسی میں ہماری بھلائی ہے، ایسا کوئی اصول وضابطہ نہیں ہے۔ ہماری ساری عزت، بھلائی، سکون، امن، دین پر چلتے ہوئے ہے۔ اگر دین کو چھوڑ کر اُن کی طرح دنیا کی طرف جائیں گے تو یہ خام خیالی ہے کہ جیسے وہ مزے کر رہے ہیں ویسے ہی ہم مزے کریں گے، ایسا نہیں ہو گا۔

امتِ محمدیہ کے مؤاخذہ کی صورتیں

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ (جب میری اُمت فسق وفجور میں جائے گی) تو حق تعالیٰ شانہ، زلازل، فتن اور قتل کے ساتھ اُس کو پکڑیں گے۔[1] جب بھی یہ اُمت عام طور پر فسق و فجور میں مبتلا ہو گی تو اللہ تعالیٰ اس کو تین صورتوں میں پکڑتے ہی رہیں گے چاہے وہ ہزاروں میں ہو، کروڑوں میں ہو، اربوں میں ہو۔ یا تو زلزلوں کی شکل میں پکڑیں گے۔ پہلی صورت زلزلے آئیں گے لاکھوں زمین کے اندر اُتر جائیں گے۔ دوسری صورت فتنے آئیں گے، فتنے مختلف شکلوں کے ہوتے ہیں۔ اور تیسرے اللہ تعالیٰ انہیں قتل کی صورت میں پکڑیں گے کہ اُن کا قتل عام ہو گا۔ آپ کسی بھی جگہ کی تاریخ کو دیکھ لیں۔ مسلمان جہاں کہیں بھی فسق وفجور میں مبتلا ہوئے تو وہاں ان تینوں صورتوں میں سے کوئی نہ کوئی صورت لازماً پائی گئی۔ لوگ یہ

---

[1]: مستدرکِ حاکم: ۸۳۴۹۔

سمجھتے ہیں کہ ان پر دُشمن مسلط ہے۔ اصل میں یہ حق تعالیٰ کا نظام ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ ولی ہیں اس لیے ایسا کر رہے ہیں۔ ان لوگوں پر یہ مصیبت ڈال کر انہیں پاک صاف کر کے جنت میں پہنچانا چاہتے ہیں۔ کوئی بھی جنت میں جانے کے قابل نہیں رہا، کیونکہ کوئی بھی جنت میں جانے کا کام نہیں کر رہا ہے۔ اب ایک کافر کو اُس پر لگا دیا کہ اس کی گردن ماردو۔ کافر نے اُس کو مار دیا۔ اب اللہ تبارک و تعالیٰ فیصلہ کرتے ہیں کہ تجھے اس لئے مارا گیا کہ تو مسلمان تھا، تجھے شہادت کا درجہ دینا تھا۔ شہید کا مرتبہ یہ ہے کہ خون کا پہلا قطرہ زمین پر گرنے سے پہلے بخش دیا جاتا ہے۔[1] جو اپنی بخشش خود نہیں کرواسکتا تو اُس کی بخشش اس طرح ہوتی ہے۔ اب مرضی ہے کہ محنت کر کے بخشش کرواؤ یا جوتے کھا کر بخشش کرواؤ، مگر ایمان والے ہونے کی وجہ سے بخشش کا انتظام ہو گا۔

آج ہی میں جمع الفوائد دیکھ رہا تھا، اُسی میں یہ حدیث دیکھی۔ اللہ تعالیٰ میری اُمت کو پکڑتے رہیں گے زلازل سے، فتنوں سے اور قتل سے اور مواخذہ کرتے رہیں گے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ ولی ہیں اور ولی ہونے کی وجہ سے اپنے ایمان والوں کا بھلا کرنا چاہتے ہیں، اُن کی بھلائی یہی ہوگی کہ اُن پر مصیبت کو ڈال کر اُن کے گناہوں کا کفارہ کیا جائے اور آخرت میں اُنہیں جنت میں پہنچایا جائے۔ ایسا دوسروں کے ساتھ نہیں ہو گا۔ اس لیے فرمایا:

اللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا

اللہ پاک ایمان والوں کے ولی ہیں۔

يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ

وہ ایمان والوں کو ظلمتوں سے نور کی طرف نکالتے ہیں۔

---

[1]: سنن ابنِ ماجہ: ۲۷۹۹۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ

کافروں کے ولی طاغوت ہیں۔

يُخْرِجُونَهُمْ مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ

وہ طاغوت انہیں نور سے نکال کر ظلمتوں کی طرف لے کر جاتے ہیں۔

ایک کام اللہ کا ہے اور ایک کام طاغوت کا ہے۔ اللہ بھی داعی ہے اور طاغوت بھی داعی ہے۔

وَاللّٰهُ يَدْعُو إِلَى دَارِ السَّلَامِ [1]

اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں سلامتی کے گھر کی طرف دعوت دیتا ہے

وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوا أَنْفُسَكُمْ [2]

میری تم پر کوئی زور زبردستی نہیں تھی، میں نے تم کو دعوت دی تھی تم نے مان لیا، لہٰذا تم مجھ پر ملامت مت کرو البتہ اپنے آپ پر ملامت کرو۔

ہدایت کی اقسام

اللہ تبارک وتعالیٰ ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف بلاتے ہیں اور لاتے ہیں۔ ایک ہے "بلانا" اور ایک ہے "لانا"۔ "بلانا" عام ہدایت کہلاتی ہے اور "لے کر آجانا" خاص ہدایت کہلاتی ہے۔ سارے انسانوں کو حق کی طرف بلایا جارہا ہے لیکن جو مسلمان ہوگئے ہیں اُنہیں لایا گیا ہے۔ ایک ہوتی ہے توفیقِ عام یعنی دلیلوں کے ذریعے سے بات کو سمجھا دینا۔ اگر آدمی نے سمجھ لیا اور ارادہ کر لیا تو اُس کو بات ماننے کی توفیق دے دینا، اس کو توفیقِ خاص کہتے ہیں۔

۱: یونس:۲۵۔ ۲: ابراھیم:۲۲۔

ہدایت کے دو مطلب بتائے جاتے ہیں ایک اراءۃ الطریق یعنی راستہ دکھلانا اور ایک ایصال الی المطلوب یعنی راستہ پر پہنچانا۔

نبی کی طرف ہدایت کی نسبت

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ [۱]

آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو چاہیں۔

آپ ﷺ کو ہادی بھی کہا گیا اور آپ کے اسمائے مبارکہ میں سے آپ کا نام ہادی بھی ہے۔ نبی کے ہادی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ راستہ بتلانے کا کام کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہادی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ راستے پر چلا دینے کا کام کرتے ہیں۔

توفیقِ خاص اسی معنی میں ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ شانہ، بندے کو لے کر چلتے ہیں۔ اس لیے بعض مفسرین نے ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ''کا ترجمہ "راستہ بتلایئے سے" کیا ہے جبکہ اکثر مفسرین نے "راستہ چلایئے"سے ترجمہ کیا ہے۔ "اے اللہ! ہمیں سیدھے راستے پر چلا دیجیے"۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو بھی آدمی نیک کام کرتا ہے وہ خود نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ اُس سے کرواتے ہیں اور اُنہی کی توفیق سے ہوتا ہے۔ یہ بات سمجھائی جاتی ہے کہ جو لوگ جماعت میں نکلتے ہیں، وہ نکلتے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نکالتے ہیں۔ یہ قدم اُٹھتے نہیں بلکہ اُٹھائے جاتے ہیں۔ آدمی اللہ کے راستے میں پیسے خرچ کرتا نہیں ہے بلکہ خرچ کروائے جاتے ہیں۔ کتنے مالدار لوگ ہیں، اللہ کے راستے میں نہیں نکلتے لیکن کیسے کیسے غریب نکل جاتے ہیں۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ۔ جو کافر ہیں اُن کے اولیاء طاغوت ہیں۔

---

[۱]: القصص:۵۶۔

يُخْرِجُونَهُمْ مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ

جو اُن کو نور سے نکالتے ہیں اور ظلمتوں کی طرف لے جاتے ہیں۔

"ظلمات" ظُلْمَۃٌ کی جمع ہے۔ ظلمتیں کئی ہوتی ہیں اور نور سے اللہ تعالیٰ کا قرب مراد ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات ایک ہے، اس لیے نور واحد ہے اور ظلمات جمع ہیں۔ چونکہ ظلمتیں کئی طرح کی ہوتی ہیں اور شیاطین و طاغوت نور سے نکال کر کئی ظلمتوں کی طرف لے جاتے ہیں، اس لئے جمع لائے۔

أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ۔ یہ لوگ جہنمی ہیں۔

هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہ جائیں گے۔

یہاں پر ایک بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ حق تعالیٰ شانہ، جب اپنے بندے سے محبت فرماتے ہیں تو اُس کی ظلمت دُور کر دیتے ہیں۔ جیسے ظلمتیں مختلف مراحل کی ہیں ایسے ہی نور کے بھی مراحل ہوتے ہیں۔

نور کی اقسام

مفسر علام صاحب مواہب الرحمن نے فرمایا کہ عام طور پر ہر مسلمان کو تین انوار کی ضرورت ہے، ایک نور "نورِ ہدایت" ہوتا ہے، ایک نور "نورِ کفایت" ہوتا ہے اور ایک نور "نورِ عنایت" ہوتا ہے۔ آدمی کا کفر سے ایمان کی طرف آجانا نورِ ہدایت کہلاتا ہے۔ آدمی کا بڑے بڑے گناہوں سے بچ کر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری پر آجانا نورِ کفایت کہلاتا ہے۔ آدمی کا غفلتوں سے، بُرے خیالات اور بُری خواہشات سے نکل کر اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف آجانا نورِ عنایت کہلاتا ہے۔ ہر ایمان والے کو ان تین انوار کی ضرورت ہے۔ تینوں انوار کے نتائج الگ الگ ہیں۔ جس کو نورِ عنایت ملتا ہے وہ خاص الخاص ہو جاتا ہے۔ جس کو نورِ عنایت تو نہیں

ملا لیکن نورِ کفایت مل گیا اور بڑے بڑے گناہوں سے بچ جاتا ہے، یہ بھی غنیمت ہے۔ ایک وہ ہوتا ہے جس کو نہ نورِ عنایت ملا اور نہ نورِ کفایت ملا لیکن کم از کم وہ ایمان کے دائرے میں تو آ گیا اُسے نورِ ہدایت مل گیا۔

نورِ ہدایت کفر سے ایمان کی طرف آ جانا، نورِ کفایت بڑے بڑے گناہوں سے بچ جانا اور نورِ عنایت بُرے خیالات اور بُرے وساوس سے بچنے کی صلاحیت کا دل کے اندر پیدا ہو جانا۔ ایک مرحلے پر آدمی اللہ تعالیٰ سے تعلق پر ایسا آ جاتا ہے کہ اُس کی غفلت دُور ہو جاتی ہے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ یاد رہتے ہیں اور اُس کو بُرے خیالات اور بُرے وساوس نہیں ستاتے، بلکہ جو خیالات اور وساوس آتے ہیں وہ بھی اچھے ہوتے ہیں، اُس میں بھی بڑی بڑی نیکیاں شامل ہوا کرتی ہیں۔ اُس کو حق تعالیٰ کی مرضیات والے خیالات آتے ہیں حالانکہ اچھے سے اچھا خیال آنے سے آدمی کا مرتبہ نہیں بڑھتا اور بُرے سے بُرا خیال آنے سے آدمی کا مرتبہ نہیں گھٹتا کیونکہ خیال آدمی کے بس میں نہیں ہے۔ یہ بات میں نے اس لیے عرض کر دی کہ بعض دفعہ جب بُرے خیال آتے ہیں تو آدمی سمجھتا ہے کہ میں بُرا ہو گیا بعض مرتبہ آدمی کچھ رہتا نہیں اور اپنے آپ کو بڑا اور اللہ والا سمجھتا ہے اور اوپر سے تو بایزید بسطامی رہتا ہے اور اندر سے یزید ہی یزید رہتا ہے۔ اس لیے بُرے سے بُرے خیالات کا آنا آدمی کو بُرا نہیں بناتا۔ اگر ایک آدمی کو بُرا سے بُرا خیال آ گیا لیکن اُس نے اس کے تقاضہ پر عمل نہیں کیا تو وہ بُرا نہیں ہوتا۔ اگر ایک آدمی کو اچھے اچھے خیالات آتے ہیں لیکن وہ اُس پر وہ عمل نہیں کرتا تو ان خیالات سے اُس کا اللہ تعالیٰ کے پاس مرتبہ نہیں بڑھتا۔ یہ اسلام کا ضابطہ ہے کہ جو چیز غیر اختیاری ہوتی ہے اُس میں آدمی کا مؤاخذہ نہیں ہوتا ہے، البتہ ایمان اور اعمال کے ساتھ جو غیر اختیاری حالات آتے ہیں اُس میں آدمی کا مرتبہ گھٹتا اور بڑھتا ہے۔

غرض یہ کہ نور مختلف قسم کا ہوتا ہے اور ظلمتیں بھی مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔ چونکہ نور کا پورا کا پورا محور حق تعالیٰ کی ذات ہے اس لیے اُسے واحد بولا جاتا ہے مگر اس میں بہت سے درجات ہیں اور ظلمتوں کی قسموں کے ساتھ ساتھ اس کے درجات بھی ہیں۔

بعض علماء نے اس کی یہ تفسیر فرمائی ہے کہ ایک ظلمت ہے کفر و شرک کی، اس کے مقابلے میں اسلام و ایمان کا نور پایا جاتا ہے اور ایک ظلمت ہے گناہِ کبیرہ کی، اس کے مقابلے میں گناہِ کبیرہ سے بچنے کا نور یعنی طاعت و استقامت کا نور ہے۔ ایک ظلمت بدعت کی پائی جاتی ہے اُس کے مقابلے میں سنت کا نور پایا جاتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ کسی کو ایک نور حاصل ہے تو دوسرا نور بھی حاصل ہو جائے اور آدمی ایک ظلمت سے بچا ہوا ہے تو دوسری ظلمت سے بھی بچ جائے۔

آدمی کو جس نوعیت کی ولایت حاصل ہے اللہ تبارک و تعالیٰ اُس نوعیت کی ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لاتے ہیں۔ اس میں بندہ محتاج ہے کہ جس نوعیت کا نور اُس کو حاصل ہے اُس سے اگلے مرحلے کا نور حاصل کرے اور وہ جس ظلمت سے بچا ہوا ہے اُس سے آگے والی ظلمت سے اپنے آپ کو بچائے۔

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بڑی بڑی چیزوں سے بچا ہوا محسوس کرتا ہے لیکن چھوٹی چھوٹی چیزوں میں پھنس جاتا ہے۔ تمام چیزوں سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کو ہدایتِ کامل ملے۔ جب آدمی کو نورِ کامل ملتا ہے تو تمام چیزوں سے بچنا آسان ہو جاتا ہے۔

شیطان کا حربہ

شیطان جو نور سے ظلمت کی طرف لاتا ہے اُس کا اصل مشن یہی ہوتا ہے۔ شیطان دیکھتا ہے کہ یہ بندہ بڑی چیزوں کو چھوڑنے والا نہیں ہے، پھر اُس سے چھوٹی چیزوں کو دیکھتا ہے کہ یہ بندہ اس کو بھی چھوڑنے والا نہیں ہے۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ

شیطان آدمی کے سامنے آکر دیکھتا ہے کہ اگر میں اس سے کہوں کہ یہ شرک کرے تو یہ شرک کرے گا یا نہیں کرے گا؟ نہیں بھئی یہ تو ماننے والا نہیں ہے۔ پھر شیطان یہ دیکھتا ہے کہ اگر میں اس سے کہوں کہ یہ گناہِ کبیرہ کرے تو یہ بندہ ماننے والا نہیں ہے۔ پھر شیطان یہ دیکھتا ہے کہ کیا میں اس کو بدعت میں مبتلا کر سکتا ہوں جو غلط ہی ہے لیکن ظاہری طور پر صحیح دکھلا دیتا ہے، لیکن یہ بندہ اس میں بھی قابو میں نہیں آرہا ہے۔ پھر شیطان یہ دیکھتا ہے کہ کیا میں اس بندے کو چھوٹے چھوٹے گناہوں میں لگا سکتا ہوں لیکن وہ یہ بھی نہیں کر سکتا کیونکہ یہ کسی اللہ والے کا صحبت یافتہ نظر آرہا ہے۔ پھر شیطان یہ دیکھتا ہے کہ کیا میں اس بندے سے سنن اور مستحبات چھڑوا سکتا ہوں۔ مستحب چھوڑنے کے مجرم کی سزا سنت سے محرومی ہے۔ جو سنت کو چھوڑتا ہے اُس کی سزا واجبات سے محرومی ہے۔ جو واجبات میں سستی کرتا ہے اُس کی سزا فرائض سے محرومی ہے۔ جس سے سنت چھوٹتی ہے آپ دیکھیں گے کہ اُس کی تکبیرِ اولیٰ اکثر چھوٹتی ہے۔ جو مستحبات کو چھوڑتا ہے اُس سے سنت میں گڑبڑ ہوتی ہے۔ یہ ایک ترتیب ہے۔

تمام نیکیاں آپس میں رشتہ دار ہیں اور ایک دوسرے کو کھینچا کرتی ہیں۔ تمام بُرائیاں آپس میں رشتہ دار ہیں اور ایک دوسرے کو کھینچا کرتی ہیں۔ آدمی چھوٹی بُرائی سے بڑی بُرائی تک چلا جاتا ہے اور آدمی چھوٹی نیکی سے بڑی نیکی تک پہنچ جاتا ہے۔

پھر سب سے آخری چیز جس سے بہت کم لوگ بچ پاتے ہیں اور شیطان کا کامیاب حربہ ہے کہ تکثیرِ مباحات یعنی جائز چیزوں کی کثرت میں مبتلا کرتا ہے۔ یہ جائز ہے، وہ جائز ہے، اچھا پہننا جائز ہے، اچھا کھانا جائز ہے، اچھا مکان بھی جائز ہے، اچھی گھڑی بھی جائز ہے، اچھی گاڑی بھی جائز ہے اور پھر اُس کی کثرت ہوتی ہے۔ دسترخوان پر دسیوں سالن رکھے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام نے یہ سب جائز کیا ہے اور یہ خدا کی نعمتیں ہیں لہٰذا خوب کھاؤ۔ جب آدمی تکثیر

مباحات میں پڑتا ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ آدمی چھوٹے گناہوں میں نہ پڑے۔ جب آدمی چھوٹے گناہوں میں پڑتا ہے تو شیطان خوش ہوتا ہے کہ میرا کام بننا شروع ہوگیا کیونکہ آدمی چھوٹے گناہوں سے بڑے گناہوں کی طرف خودبخود جاتا ہے اور بڑے گناہوں کے بعد آدمی کبھی کبھی (اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے) ایمان سے بھی محروم ہوجاتا ہے۔

بعض دفعہ مرنے کے وقت سوئے خاتمہ کے واقعات پیش آتے ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ آدمی مرتے وقت بے ایمان نہیں مرتا بلکہ گناہوں کی نحوست کی وجہ سے پہلے ہی بے ایمان ہوچکا ہوتا ہے، بس اُس کا ظہور مرتے وقت میں ہورہا ہے۔ اپنے ذہن میں وہ خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ میں ایمان والا ہوں۔ یہ بڑی خطرناک بات ہوتی ہے کہ یہاں پر آدمی کو خوش فہمی ہو اور وہاں جاتے ہوئے آخر میں ایسے وقت میں پتہ چلے جب عالمِ غیب عالمِ مشاہدہ بن چکا ہے اور پھر اُس وقت ایمان معتبر نہیں ہوتا، اُس وقت ایمان لانا فائدہ بھی نہیں دیتا، وہ بہت خطرناک صورتحال ہوتی ہے۔

کمالِ ایمان کے حصول کا طریقہ

اسی واسطے حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنے آپ کو پکڑتے (تھامے رہتے) تھے۔ آدمی کو کامل نور حاصل کرنے کے لیے یہاں تک جانا پڑتا ہے۔ اللہ کے راستے میں نکلنا، مجاہدے کرنا، خود پکاکر کھانا، ظاہر ہے ان تمام چیزوں کا اسلام میں باضابطہ حکم تو نہیں ہے مگر ان تمام چیزوں کے بعد نفس میں اللہ کے اوامر پر جمنے اور ناجائز چیزوں سے بچنے کی استعداد پیدا ہوتی ہے۔

اسی وجہ سے نبی اکرم ﷺ بھی مباح چیزوں کو ترک کرتے تھے [۱] حضراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی جائز چیزوں کو چھوڑ دیتے تھے [۲] تاکہ ایک ناجائز چیز کے قریب بھی نہ جائیں۔ اُن کا ایمان، اُن کی ایمانی طاقت، اُن کا مزاج، حضور پاک ﷺ کی صحبت کی برکت سے اس حال پر تھا۔

حضرت عمر کا معیار

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کرامت میں سے ہے کہ جب فتوحات کا زمانہ شروع ہوا تو کسی کی زندگی کا معیار بڑھنے نہیں دیا۔ جیسے کوئی جس نوعیت کا کپڑا پہنتا تھا اگر وہ اس کو گورنر بناتے تو اس شرط پر بناتے کہ گورنر بننے کے بعد عمدہ گھوڑے پر سواری نہیں کروگے باریک کپڑا نہیں پہنوگے کسی محتاج کے لیے دروازہ بند نہیں کروگے اور عمدہ کھانا نہیں کھاؤگے [۳] ضروری نہیں ہے کہ ہر آدمی ایسا کرے مگر ان لوگوں نے اتنی احتیاط برتی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قصہ

جابر ابن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے ایک مرتبہ وہ پیدل جا رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا اور پوچھا: "یہ ہاتھ میں کیا ہے؟" کہا: "گوشت خرید کر آرہا ہوں گھر والوں کی خواہش ہے۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ سن کر غصہ آگیا اور فرمایا: گھر والوں کی خواہش ہے ، گھر والوں کی خواہش ہے بار بار دہرایا۔" وہ افسوس میں کہنے لگے: کاش درہم راستہ میں ہی گر جاتے اور میں حضرت عمر سے اس حال میں نہ ملتا۔ [۴] حالانکہ حضرت

۱: الاوسط لابن المنذر: ۴۱۰۔ ۲: تفسیر روح المعانی: ۲ / ۲۷۱۔ ۳: مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۵۹۱۔ ۴: کنز العمال: ۵۲۸۵۔

جابر رضی اللہ عنہ کوئی ناجائز کام کرنے نہیں جارہے تھے، وہ جائز کام ہی تھا، مگر اصل بات یہ ہے کہ حضور ﷺ نے سادہ معاشرت کی تعلیم دی، تکلّفات والی معاشرت کی تعلیم نہیں دی۔

جتنی رعایت اتنی دشمنی

یہ بات میں نے اس پر عرض کی کہ شیطان آدمی کو کس طرح نور سے نکال کر ظلمت کی طرف لے جاتا ہے۔ آپ کا ہاتھ پکڑ کر نہیں لے جاتا، آپ کو زبردستی نہیں لے جاتا۔ نور سے نکالنے کا مفہوم یہ ہے کہ شیطان اس کو ترغیب دیتا ہے اور آمادہ کرتا ہے اور آدمی کو اپنے راستے پر ڈالتا ہے۔ اسی لیے آدمی کو شیطان کے راستے سے واقف ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو اس شیطانی راستے سے بچاسکے۔ نفس کا بھی یہی کام ہے۔ جب نفس دیکھتا ہے کہ یہ میری بات نہیں مان رہا ہے تو نفس بڑی خواہش سے چھوٹی خواہش پر آجاتا ہے اور جب چھوٹی خواہشات پوری ہونے لگتی ہیں تو اُسے بڑی خواہشات کی طرف لے جاتا ہے۔

نفس آدمی کا ایسا دُشمن ہے کہ آپ اُس کی جتنی رعایت کریں گے اُس کی دُشمنی اُتنی اور بڑھ جائے گی۔ پوری دنیا میں دُشمنی کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ دُشمن کی رعایت کریں گے تو دُشمنی کم ہو جائے گی جبکہ نفس کی خصوصیت ایسی ہے کہ جہاں آپ اُس کی رعایت کریں گے تو اُس کی دُشمنی بڑھ جائے گی۔ نفس و شیطان انسان کو نور سے نکال کر ظلمت کی طرف لاتے ہیں حق تعالیٰ جل جلالہ، و عم نوالہ، انسانوں کو ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے ولی ہیں اور شیاطین کافروں کے ولی ہیں۔ ولایت سے کوئی بھی خالی نہیں ہے، ولی وہ بھی ہیں اور ولی یہ بھی ہیں، کوئی ولی الرحمن ہے تو کوئی ولی الشیطان ہے۔ کوئی ولی اللہ ہے اور کوئی ولی الطاغوت ہے، سب کے سب ولی ہیں۔

ولایتِ کی اقسام

ایمان والوں کی ولایت کی دو قسمیں ہیں ایک ولایتِ عامہ اور دوسری ولایتِ خاصہ۔ "ولایتِ عامہ" یہ ہے کہ آدمی شرک سے توبہ کرکے ایمان میں داخل ہوگیا، اُس کو حق تعالیٰ شانہ، کی ولایت حاصل ہوگئی۔ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ولی ہوگیا۔

ایمان لانے کی وجہ سے ہر مؤمن کو ولایتِ عامہ حاصل ہو جاتی ہے۔ شرک کی ظلمت سب سے بڑی ظلمت ہے۔ کفر و الحاد اور نفاق یہ تینوں چیزیں بھی شرک ہی کی قسم میں سے ہیں۔ دہریت بھی اسی میں شامل ہے، اللہ کو بالکل نہ ماننا یہ دہریت ہے۔ جو باتیں اللہ کے متعلق ماننے کی ہیں اُنہیں نہ ماننا کفر ہے۔ جو باتیں غیر اللہ کے متعلق نہ ماننے کی ہیں، اُنہیں ماننا شرک ہے۔ اندرونی طور پر نہ ماننا لیکن ظاہری طور پر مان لینا یہ نفاق ہے۔ یہ چار قسمیں ہوتی ہیں۔ یہ سب سے بڑی ظلمت ہے۔ اگر آدمی اس ظلمت سے نکل گیا تو وہ کسی نہ کسی درجے کے نور کو پا جاتا ہے۔ اس لیے کہ ہر ایمان والا اللہ کا ولی ہوتا ہے۔ یہ بات سچی ہے۔ اس کو ولایتِ عامہ کہتے ہیں۔

جماعت میں آئے ہوئے بہت سے پاکستانی بھائیوں کو یہ کہتے ہوئے سنا "ارے اللہ کے ولی! اس کام کو مت کر!" دیکھنے کے اعتبار سے وہ ولی (خاص) نہیں ہے لیکن عرف کی وجہ سے زبان پر یہ لفظ چڑھا ہوا ہے "اللہ کے ولی! ذرا چائے تو بنادے" حالانکہ جو مسلمان ہے وہ اللہ کا ولی ہی ہے۔ اگر کسی مسلمان کو یہ احساس ہو جائے کہ میں بھی اللہ کا ولی ہوں، اس کو کسی نہ کسی درجے میں اللہ تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے۔ اور اللہ سے محبت ہونے کا اصل نام اللہ کی ولایت ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے بندے سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایمان والا اللہ کا ولی ہے۔ "ولی" کے معنی دوست اور ساتھ دینے والے کے ہیں۔ جب "ولی" کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے تو اُس کا مطلب الگ ہے اور جب "ولی" کی نسبت

بندے کی طرف ہوتی ہے تو اُس کا مطلب الگ ہے۔ ایک ہی لفظ کے دو مطلب نکلتے ہیں۔ جب "ولی" کی نسبت بندے کی طرف ہوتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اللہ سے دوستی کرتا ہے یا محبت رکھتا ہے اور "ولی اللہ" کا مطلب ہے اللہ کا چنا ہوا، اللہ نے اس سے محبت کی۔

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا

اللہ تعالیٰ ایمان والوں سے محبت رکھتے ہیں اور اُن کو اپنی ولایتِ عامہ میں لے لیتے ہیں۔

مؤمنوں اور غیر مؤمنوں کے ساتھ حق تعالیٰ کا ضابطہ

یہی وجہ ہے کہ مؤمنوں کے ساتھ اور غیر مؤمنوں کے ساتھ حق تعالیٰ کا ضابطہ بالکل الگ ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ عام مسلمان غیر مسلموں سے بہر حال بہتر ہیں۔ چاہے وہ شرابی ہوں، کبابی ہوں، جواری ہوں، سود خور ہوں، رشوت خور ہوں، کچھ بھی ہوں، بس مسلمان ہوں۔ جب اَشۡھَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشۡھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوۡلُ اللّٰہِ کے ذریعہ گواہی دیتے ہیں تو پھر ایسے لوگ کافروں سے بہر حال بہتر ہیں۔ اس گواہی کے تقاضوں پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے سزا بھگتنے کے بعد یہ لوگ جنت میں چلے جائیں گے۔ بہر حال ان لوگوں کو بھی جنت میں جانا ہے اور یہ حضور ﷺ کی بشارت ہے اور حضور ﷺ کی برکت سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے جتنے نبی آئے ہیں اُن کی اُمتوں میں سے کچھ جنت میں جائیں گے اور کچھ نہیں جائیں گے سوائے میری اُمت کے جو پوری کی پوری جنت میں جائے گی سوائے مشرک کے۔[۱] علماء نے اس کا مفہوم لکھا ہے کہ کچھ لوگ کمالِ استعداد کی وجہ سے شروع ہی سے جنت میں جانے والے ہوں گے اور کچھ لوگوں کو چاہے اعمال کی سزا بھگتنی پڑے، اُس کے بعد وہ جنت میں چلے جائیں گے۔ جب جہنمیوں کو جہنم میں پڑے ہوئے

۱: مسندِ احمد: ۲۷۴۲۔

عرصہ گزر جائے گا تو کافر جہنمی مسلمان جہنمیوں سے کہیں گے کہ دنیا میں جس دین کی طرف تم دعوت دیتے تھے وہ اگر حق تھا جیسا کہ تم کہتے ہو تو پھر تم کو جہنم میں کیوں ڈالا گیا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے کافروں کا یہ طعنہ سنیں گے تو مسلمانوں کی قسمت چمک جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کو غصہ آجائے گا کہ میرے ماننے والوں کو یہ بدبخت کافر ایسا کہہ رہے ہیں اور یہ طعنہ دیا ہے،! جہنم میں جتنے ایمان والے ہیں اُن سب کو نکالو۔ [۱] کافروں کے طعنہ دینے کی وجہ سے مسلمان جہنم سے نکل جائیں گے۔

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ [۲]

اُس وقت کافر تمنا کریں گے کہ کاش! وہ مسلمان ہوتے تو آج کام بن جاتا۔ یہ آیت اسی موقع کے لیے ہے۔ اس کے شانِ نزول میں بتایا گیا کہ اس موقع پر جب جہنمی کفار جہنمی مسلمانوں کو طعنہ دیں گے تو اُس پر غیرتِ الٰہی جوش میں آئے گی اور تمام ایمان والوں کے لیے جہنم سے نکلنے کا فیصلہ صادر ہو جائے گا تو اُس وقت کافر کہیں گے کہ ان کا تو زبانی ایمان بھی کام آگیا، کاش! ہم بھی مسلمان ہوتے۔ [۳]

صرف ایمان بھی بہت بڑی دولت ہے

بہرحال یہ ایمان آدمی کو نفع دے گا، اس لیے ایمان بہت بڑی دولت ہے۔ جس کے پاس ایمان ہے وہ اِس دنیا سے دس گنا بڑی دولت اپنے پاس رکھتا ہے۔ اب یہ دولت کب ملے گی، بعض مرتبہ کسٹم یا بینک میں سے مال نکلنے میں دیر ہو جاتی ہے، کسی وجہ سے مال رُک جاتا ہے، اُس پر مقدمہ چلتا ہے، دس سال یا پندرہ سال میں ملے گا معلوم نہیں لیکن ملے گا ضرور۔ اسی

۱: تفسیر ابنِ کثیر: ۴ / ۵۲۴۔ ۲: الحجر: ۲۔ ۳: تفسیر طبری: ۱۷ / ۶۱۔

طریقے سے جنت ایمان پر موت آنے والے کو ضرور ملے گی، لیکن کب ملے گی؟ یہ نہیں بتاسکتے۔ آپ کہیں گے کہ یہ اتنا سستا سودا ہے، ہم خوامخواہ چلّے پر نکلے ہوئے ہیں۔

تبلیغ میں جانے کا مقصد

میرے بھائیو! اس کا اصل قصہ یہ ہے کہ یہ چلّے دو وجہ سے ہیں۔ ایک وجہ یہ کہ اس کا کیا یقین ہے کہ ہم ایمان پر مریں گے۔ خاتمے کا اعتبار ہے، ہم ایمان پر مریں گے یا نہیں مریں گے اس کی کیا ضمانت ہے؟ ایک تو اس کی کوشش کرنی ہے کہ جتنی زیادہ کوشش ہوگی اتنا ہی خاتمہ بالخیر کا قوی امکان ہوگا۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ آدمی اسی حالت میں مرے گا جس حالت میں وہ زندگی گزارتا تھا اور اسی حالت میں وہ اٹھایا جائیگا جس حالت میں وہ مرا ہے۔

"تَمُوْتُوْنَ كَمَا تَعِيْشُوْنَ وَتُبْعَثُوْنَ كَمَا تَمُوْتُوْنَ"[1]

دنیا میں نیک اعمال کرتا تھا تو خاتمہ بھی نیک ہوگا اور اگر برے اعمال کرتا تھا تو خاتمہ بھی برا ہوگا دوسری بات یہ ہے کہ جب ہم دنیا میں نیک کام کرنے کے لیے آئے ہیں اور چند روزہ قیام ہے تو خوب مستعدی سے نیک کام کریں تاکہ اوّل درجے میں حق تعالیٰ کا فضل ملے۔ گنہگار اہل ایمان پہلے جہنم میں جائیں گے اور پھر جنت میں جائیں گے، لیکن کون اس کے لیے راضی ہے؟ کون اس بات کے لیے راضی ہے کہ پہلے اُس کو یہاں پر بیس پچیس سال قید میں ڈالا جائے، اُس کے بعد اُس کو گرین کارڈ دیا جائے۔ یہ بات کوئی ماننے کے لیے تیار نہیں۔

حضرت شیخ نے لکھا ہے کہ ایک نماز کو جان بوجھ کر چھوڑ دینے کی وجہ سے از روئے قانون آدمی کو دو کروڑ سال سے زائد جہنم میں ٹھہرایا جاسکتا ہے۔[2]

۱: تفسیر روح البیان: ۲ / ۲۱۰۔ ۲: فضائل نماز: ۱ / ۲۳۱۔

ایمان والا ہے، جنت میں جائے گا لیکن ایک نماز چھوڑنے پر دو کروڑ سال جہنم میں ٹھہر سکتا ہے، نماز کا حساب الگ ہے، زکوٰۃ کا الگ ہے، حج کا الگ ہے، بیوی کے حقوق الگ ہیں، بچوں کے حقوق الگ ہیں، اس لیے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان دیا ہے تو اُس کی قدر کریں اور اس کے نفع کو پہچانیں اور اپنے اندر ایسی کیفیت پیدا کریں کہ اوّلین درجے میں جنت مل جائے۔ یہاں آدمی مرا اور مرنے سے پہلے ہی سے حق تعالیٰ شانہ، فرمادیں:

إِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوْا [1]

اگر آدمی استقامت کے ساتھ رہا تو فرشتے اُس کے اوپر اُترتے ہیں اور بشارت دیتے ہیں کہ تم خوف و حزن مت کرو، اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے جنت کی خوشخبری ہے۔ یہاں پر اُس کا اکرام شروع ہو جاتا ہے اور اُس کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے، قبر اور حشر میں آرام ملتا ہے۔ اگر کامل ایمان والا ہے تو پھر شروع ہی سے آدمی پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہو گا۔

مسلمان اور کافر میں جوڑ نہیں

یہ بات اس پر عرض کر رہا تھا کہ تمام ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ کی ولایتِ عامہ حاصل ہے، یہ بھی بڑی قدر کی چیز ہے۔ اس لیے کبھی بھی مسلمان کو کافر کے ساتھ نہیں ملانا چاہیے۔ اور کبھی بھی یہ نہیں کہنا ہے کہ مسلمانوں سے اچھے تو کافر ہیں۔ بعض جگہ یہ سننے میں آتا ہے کہ ارے بھائی! اِن مسلمانوں سے اچھے تو کافر ہیں۔ کسی بھی مسلمان سے کوئی بھی کافر کبھی بھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ مسلمان بہر حال اچھا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ولی ہونے کی وجہ سے مسلمان کے گناہوں کا دنیا میں مصیبتوں اور پریشانیوں سے کفارہ کرتے رہتے ہیں۔

---

[1] فصلت: ۳۰۔

گنہگار مسلمان کا مؤاخذہ کیوں؟

یہاں پر اللہ تعالیٰ کا ایک ضابطہ یاد آگیا۔ جو مسلمان ہوگا اور اُس کے بعد وہ بُرا ہوگا تو حق تعالیٰ اُس کو نہیں چھوڑتے۔ جو کافر ہوگا اور وہ بُرا ہوگا تو حق تعالیٰ اُس کو چھوڑ دیتے ہیں اور کبھی پکڑتے ہیں۔ لیکن جو مسلمان ہوگا اور بُرا بھی ہوگا تو اللہ تعالیٰ اُس کو نہیں چھوڑتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے ولی ہیں، آخرت میں مسلمان پر کم بوجھ پڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ دنیا میں نمٹاتے رہتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دنیا میں میری اُمت کی سزا زلزلے ہیں، فتنے ہیں اور قتل ہیں۔[۱] اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے میری اُمت کو پاک فرماتے رہیں گے۔ مسلمانوں کا بوسنیا میں قتل ہو رہا ہے، صومالیہ میں قتل ہو رہا ہے، فلسطین میں قتل ہو رہا ہے، رُوس میں قتل ہو رہا ہے، وہ تو ہوگا ہی۔

مسلمانوں پر قتل مسلط ہونے کی وجہ

یہ قتل دو وجہ سے ہوتا ہے۔ ایک تو اس وجہ سے ہوتا ہے کہ جب مسلمان اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے اپنی حد پر آگیا اور اُس سے توقع نہیں ہوتی کہ مجاہدہ اختیار کرکے اپنے اعمال درست کرے گا تو چونکہ اللہ ولی ہیں، تو ولایت کی وجہ سے یہ کرتے ہیں کہ کافر کو مسلط کر دیتے ہیں اور کافر نے مسلمان ہونے کی وجہ سے مارا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کافر نے اس لیے مارا کہ یہ مسلمان ہے، چلو! اس کو شہادت کا ثواب دو۔ جو ثواب مسلمان اپنے اعمال سے نہیں کما سکا اور اُس سے اس کی توقع بھی ختم ہو جاتی ہے، تو کافروں کو مسلط کیا جاتا ہے تاکہ اُن کا قتلِ عام ہو اور یہ جتنے مقتول ہوتے ہیں سب جنت میں جاتے ہیں۔ اگر ایمان کے ساتھ قتل ہوئے ہوں۔

---

[۱]: مستدرک حاکم: ۷۶۴۹۔

دوسرے اس وجہ سے مسلمانوں پر قتل مسلط ہوتا ہے کہ جو کافر مسلمانوں کو قتل کر کے نقصان پہنچا رہے ہیں، یہ مقتول مسلمان قتل ہونے سے پہلے اُن کافروں کا اُس سے زیادہ نقصان پہنچا چکے ہوتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ وہ کیسے؟ جتنے کافر، مشرک، یہودی، عیسائی، بدھ مت، برہمن وغیرہ ہیں وہ سب کے سب نجات نہیں پائیں گے۔ نجات صرف وہی پائے گا جو اسلام لائے گا، جو ایمان لائے گا، یہ راز مسلمان کو معلوم ہے۔ مسلمان اس بات کو جانتا ہے، قرآن پاک میں یہ بات بتادی گئی اور آخری نبی ﷺ نے یہ بات سمجھادی ہے کہ صرف وہی آدمی جہنم سے بچے گا جس کے پاس ایمان و اسلام ہو گا اور جو کوئی بے ایمان مرے گا وہ جہنم میں جائے گا۔ یہ مسلمانوں کے پاس امانت ہے۔ اگر یہ امانت مسلمان غیر مسلموں کو نہیں پہنچاتے ہیں تو اُن کا قتل سے بھی زیادہ نقصان کر رہے ہیں۔ آپ کہیں گے یہ کافروں کا اپنا نقصان ہے کہ وہ اسلام کو نہیں لے رہے ہیں؟

پوری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے

اس کو اس بات سے سمجھئے:

اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللهِ[1]

پوری کی پوری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ یہ الفاظ حدیث ہی کے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی مخلوق سے محبت کرتے ہیں اور حق تعالیٰ شانہ، اپنی مخلوق کے بارے میں یہ چاہتے ہیں کہ سب کے سب کامیاب ہوں مگر انہوں نے سب کی کامیابی کا فیصلہ نہیں کیا ہے جیسے موت وحیات کا فیصلہ غیر اختیاری کیا ہے۔ لیکن یہ معاملہ انسانوں کے اختیار ہی پر رکھا ہے۔ تم اپنے اختیار سے ہدایت کو قبول کرو تاکہ میں تم کو کامیاب کر کے جنت میں پہنچاؤں۔ اُس کے لیے ایک

---

[1]: شعب الایمان: ۷۴۴۴۔

ضابطہ بنایا ہے۔ جو ضابطے کے اعتبار سے ارادہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ اُس کو اسلام کی توفیق دیں گے، پھر وہ جنت میں جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی ہر مخلوق سے محبت ہے، ایسا نہیں ہے کہ صرف مسلمانوں سے ہے۔ انہوں نے ہم سب کو پیدا کیا ہے۔ تب ہی تو ساری مخلوق تابع ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں روزی دے رہے ہیں، زندگی دے رہے ہیں، تندرستی دے رہے ہیں، خواہشات پوری ہو رہی ہیں، مکانات بن رہے ہیں، دکانیں بن رہی ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے تو ملا ہے، کسی غیر اللہ کی طرف سے تھوڑا ہی ملا ہے۔ پوری مخلوق چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلمان سب کو صرف اور صرف اللہ ہی سے ملتا ہے، غیر اللہ سے مخلوق کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ اللہ تعالیٰ مخلوق کو بے حد چاہتے ہیں۔ اب اُس کے لیے اللہ تعالیٰ ضروری کر دیتے ہیں کہ مجھ ہی سے مانگو، نبیوں کے سلسلے کو ختم کر دیا اور آخری نبی بھی بھیج دیا اور ضابطہ بھی بتا دیا ہے کہ جو رسولوں کی پیروی کرے گا میں اُس کو کامیاب کروں گا۔ رسولوں کی پیروی آدمی اُسی وقت کرے گا جب اُن تک پہنچے گا اور اُن کو سمجھے گا۔ انسانوں کے مخصوص طبقے کے ساتھ میں یہ اصول ہے۔ اب یہ لوگ اُن تک یہ اصول نہیں پہنچاتے تو چونکہ قبول نہ کرنے کی وجہ سے یا اُن تک یہ اصول نہ پہنچنے یا نہ سمجھانے کی وجہ سے وہ مخلوق جہنم میں جا رہی ہے تو حق تعالیٰ شانہ، کو اس مخصوص طبقہ پر غصہ آتا ہے۔ ان لوگوں کو راستہ کیوں نہیں بتایا جا رہا، اس لیے ان کی پٹائی ہوتی ہے۔ بہر حال وہ اپنے اختیار سے کفر اختیار کیے ہوئے ہیں اس لیے آخرت میں ان کی وجہ سے اس طبقہ کی پٹائی نہیں ہو گی۔ قتل کرتے ہی اُن کو بخش دیا جائے گا اور وہ شہید ہوں گے۔

تبلیغِ اسلام مسلمانوں کی ذمہ داری

جیسے ایک بچہ ہے۔ اسکے سامنے گٹر ہے، اُس بچے کو علم نہیں تھا۔ وہاں ایک آدمی کھڑا ہے اور اُس کے سامنے بچہ پانی میں ڈوب گیا اور یہ آدمی اُس بچے کو بچانے پر قادر بھی تھا۔ بچے کے

ڈوبنے پر افسوس تو ہو گا ہی لیکن اُس سے زیادہ اُس آدمی پر افسوس ہو گا کہ وہ کھڑا رہا اور قدرت ہونے کے باوجود اُس نے بچے کو نہیں بچایا۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ پکڑنے کی استعداد کے باوجود نہیں پکڑا، یہ پکڑ سکتا تھا، اس کو پکڑنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اُس سے کہا جائے کہ بچہ تمہارے سامنے ڈوب گیا، تم اُس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتے تھے؟ اب وہ کہے کہ میرا بچہ تو ہے نہیں۔ جیسے اِس پر غصہ آتا ہے ایسے ہی حق تعالیٰ جل جلالہ، کو اُن لوگوں تک دعوت اور امانت نہ پہنچنے کی وجہ سے مسلمانوں پر خفگی و ناراضگی ہوتی ہے۔ کروڑہا آدمی بغیر کلمہ پاک اور بغیر ایمان کے مر رہے ہیں۔ یہ مسلمان اس طرح اس کے ذمہ دار ہیں۔ اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلط کر کے اس طرح اس کی بھی سزا دے دیں گے کہ اِن کی گردنیں کاٹو، ان کے مالوں کو چھینو، ان کی دکانوں کو جلاؤ۔ اس لیے فرمایا کہ دنیا میں اس اُمت کی سزا قتل ہے کہ قتل کرنے میں دُشمن ان پر مسلط ہو گا اور اس اُمت کی سزا فتنے ہیں کہ ان کو مختلف فتنوں میں گھیرا جائے گا اور زلزلے ہیں کہ زلزلوں سے ان کو ہلاک کیا جائے گا۔

جو آدمی ان تک دین پہنچانے کی دعوت اور محنت کرے گا حق تعالیٰ شانہ، حشر کے وقت اُس کی وکالت فرمائیں گے اور سب کی سزا میں سے اُس کو نکال دیں گے۔ اُس نے اس فریضہ کو ادا کیا جس کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ ناراض ہیں، اُس سے وہ بچ گیا اور اگر آدمی نے اپنی ذات سے اطاعت و فرمانبرداری کی اور اس کام کو نہیں کیا تو دنیا میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا مسلمانوں کے ساتھ میں سزا کا ضابطہ عام ہے تو عام طور پر سزا میں ایسا آدمی بھی داخل ہو جاتا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے جبرئیل! فلاں شہر کو پلٹ دو۔ جبرئیل علیہ السلام اس شہر کو پلٹنے کے واسطے آئے تو وہاں پر ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ اللہ کا ایسا بندہ ہے جس سے کبھی اللہ کی نافرمانی نہیں ہوئی۔ جبرئیل علیہ السلام بارگاہِ ایزدی میں پہنچے اور کہنے

لگے: "اے پروردگار! یہ آپ کا ایسا بندہ ہے جس نے آپ کی ایک پلک جھپکنے کے برابر بھی نافرمانی نہیں کی۔" فرمایا کہ بستی کو پلٹنے کا کام وہیں سے شروع کرو۔ پہلے اُس بستی کو پلٹو پھر دوسروں کو پلٹو۔ اس کے چہرے پر میری وجہ سے کبھی شکن تک نہیں آئی کہ مخلوق کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔[1]

آخرت میں ایسا نہیں ہو گا کہ پہلے اس کو جہنم میں ڈالیں گے پھر دوسروں کو ڈالیں گے؛ بلکہ آخرت میں اس کو معاف کر دیں گے لیکن دنیا میں اُسی نظام کے واسطے سزا رکھی گئی ہے۔ یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ضابطہ ہے۔

ولایتِ عامہ کا فائدہ

میں ولایتِ عامہ کی بات عرض کر رہا تھا چونکہ اللہ تعالیٰ تمام ایمان والوں کے ولی ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ اس ولایتِ عامہ کی وجہ سے مسلمان کا کم سے کم نقصان چاہتے ہیں اور اصل یہ ہے کہ آدمی آخرت کے نقصان سے بچ جائے۔ اگر آدمی دنیا و آخرت دونوں کے نقصان سے بچ سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ دونوں سے بچا لیتے ہیں۔ اور اگر دونوں میں سے کسی ایک سے بچ سکتا ہے تو اُسے آخرت کے نقصان سے بچا لیتے ہیں۔ اس لیے جس مسلمان پر جو حالات یا کوئی تکلیف آئے تو اللہ سے شکوہ نہیں کرنا چاہیے کہ ہمارے ساتھ ایسا ہوا اور اُن کے ساتھ تو کچھ نہیں ہوا۔ ارے تم سے اللہ کو محبت ہے اس لیے تمہارے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہے۔

اور پھر حضور ﷺ نے بشارتیں دی ہیں اور یہاں تک فرمایا کہ مسلمان کو کوئی بھی تکلیف پہنچتی ہے بدنی، قلبی، جسمانی، مالی، اللہ تبارک و تعالیٰ اُس کے گناہوں کا کفارہ کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر اُس کو کانٹا چبھ جائے تب بھی اللہ تعالیٰ اُس کے گناہوں کا کفارہ فرماتے ہیں۔

---

[1]: شعب الایمان: ۷۱۸۹۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ مومن کو کوئی تکلیف، غم جو بھی پہونچتا ہے حتی کہ کانٹے کی تکلیف یا اس سے بھی کم درجہ کی تکلیف ہو، اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اس کے گناہوں کو معاف فرماتے ہیں۔ [۱]

اگر یہی مصیبت کسی کافر پر آرہی ہے تو وہ مصیبت برائے مصیبت ہے کیونکہ کافر کو آخرت میں کوئی ثواب نہیں ملے گا اور نہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہوگا۔ مؤمن پر آنے والی مصیبت، مصیبت برائے اصلاح یا کفارہ ہے۔ یہ ولایتِ عامہ کے اثرات ہیں۔

ولایتِ خاصہ

ایک ولایتِ خاصّہ ہوتی ہے جن کو ہم اولیاء اللہ اور بزرگوں کے نام سے جانتے ہیں وہ ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس کی تفصیل آج ہی بیان کرنا چاہتا تھا لیکن تھوڑی دیر ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو آئندہ بیان کروں گا۔ ابھی تھوڑا سا عرض کر دیتا ہوں۔ ہر مسلمان کو ولایتِ خاصہ حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ نبوت وہبی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے جس کو نبی بنانا چاہا اُس کو نبی بنادیا، کوئی آدمی اپنی کوشش سے نبی نہیں ہوا جبکہ ولایت کسبی ہوتی ہے اور مقصود بھی ہوتی ہے یعنی ولایت حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی دیتے ہیں لیکن بندے کی کوشش اور محنت پر دیتے ہیں۔ ولایتِ عامہ اور ولایتِ خاصہ کا معاملہ بالکل الگ ہوتا ہے۔ ولی خاص جن کو ہم ولی اللہ اور بزرگانِ دین کہتے ہیں، یہ بہت بڑا شرف ہے، بہت ہی بڑی بات ہے۔

حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن انسانوں کا ایک طبقہ ایسا ہوگا جس پر انبیاء، شہداء اور صدیقین کو رشک ہوگا اور وہ اللہ کے ولی ہوں گے۔ [۲]

۱: صحیح بخاری:۵۲۱۹۔ ۲: شعب الایمان:۴۰۹۔

اس سے معلوم ہوا کہ "ولایت" ایک خاص مرتبہ ہے، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ تعلق کی ایک شان ہے۔ قرآن پاک میں بھی اس کی بڑی فضیلت آئی ہے:

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ [۱]

سن لو جو اللہ کے ولی ہیں اُن کو کوئی خوف اور حزن نہیں ہوگا، وہ آئندہ کے بارے میں اندیشہ نہیں کریں گے اور گذشتہ کے بارے میں رنج نہیں کریں گے۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ [۲]

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایمان قبول کیا اور تقویٰ اختیار کیے ہوئے رہے۔

كَانُوا يَتَّقُونَ کا مطلب ہے کہ صرف تقویٰ کر کے چھوڑ نہیں دیا بلکہ تقویٰ پر قائم رہے، متقی رہے۔ اللہ والوں سے یہی مراد ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آدمی سمجھے کہ اللہ والے زمین کی مخلوق نہیں ہوتے ہیں، کوئی اور مخلوق ہوتے ہیں۔ یہ عام انسانوں والا کام نہیں کرتے، ایسی بات نہیں ہے۔ اللہ والے کا مفہوم " الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ" یعنی ایمان لانے کے بعد ایمان کے تقاضوں پر جم جاتے ہیں تو ایسے لوگ اللہ کے ولی ہو جاتے ہیں۔

لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ

اُن کو اللہ کی طرف سے دنیا اور آخرت کی زندگی میں خوشخبری ہوتی ہے۔

لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ   اللہ کی باتیں بدلتی نہیں ہیں

ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ [۳]

یہی بڑی کامیابی ہے، جس کو اللہ کی یہ ولایت مل گئی ہے وہ بڑا کامیاب ہے

۱: یونس:۶۲۔ ۲: یونس: ۶۳۔ ۳: یونس:۶۴۔

ولایت کے درجات

ایمان اور تقویٰ کے درجات ہیں۔ اگر ادنیٰ درجے کا ایمان اور ادنیٰ درجے کا تقویٰ ہے (جس میں اعمال شامل ہوتے ہیں) تو ولایت بھی ادنیٰ درجے کی ہے۔ اگر متوسط درجے کا ایمان اور متوسط درجے کا تقویٰ ہے تو ولایت بھی متوسط درجے کی ہے۔ اگر اعلیٰ درجے کا ایمان اور اعلیٰ درجے کا تقویٰ ہے تو ولایت بھی اعلیٰ درجے کی ہے۔ پھر ایمان کے درجات میں تفاوت کے اعتبار سے ولایت کے درجات میں بھی تفاوت ہو گا۔

اولیاء اللہ کے لئے بشارت

اللہ کے ولیوں کو موت کے وقت خوف نہیں ہوتا۔ ان کے پیچھے رہ جانے والے لوگوں اور اولاد وغیرہ کے بارے میں تسلی دی جاتی ہے کہ تم مطمئن اور بے فکر رہو۔ خوف آگے کی چیز میں ہوتا ہے کہ پتہ نہیں کیا ہو گا؟ اور حزن پیچھے کی چیز میں ہوتا ہے کہ میں جارہا ہوں، پتہ نہیں میرے بیوی بچوں کا کیا ہو گا، میرے کاروبار کا کیا ہو گا، میری جائیداد کا کیا ہو گا۔ ولی اللہ کو حق تعالیٰ شانہ، کے ساتھ اتنا تعلق ہوتا ہے کہ اُن کو بشارت دی جاتی ہے کہ تم خوف اور حزن نہ کرو، آخر تک ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم نے انتظام کر رکھا ہے۔ اللہ تبارک وتعالی فرشتوں کو بھیج کر خوشخبری دے دیتے ہیں کہ میرے بندے کو تسلی دیتے رہو، اطمینان دلاتے رہو کہ ہم اُس سے خوش ہیں۔

ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً [۱]

چل تو اپنے پروردگار کی طرف اس حال میں کہ تو بھی خوش اور وہ بھی خوش

۱: الفجر:۲۸۔

اللہ تعالیٰ کے پاس تو ناراضگی ہے ہی نہیں، اللہ تعالیٰ اس بندے سے خوش ہیں۔ مگر بندے کو خوف ہوتا ہے کہ معلوم نہیں کہ کس غلطی پر میری پکڑ ہو جائے۔

موت کے وقت مومن کی شرمندگی

اَلْمُؤْمِنُ یَمُوْتُ بِعَرَقِ الْجَبِیْنِ [1]

ایمان والا مرتا ہے پیشانی کے پسینے کے ساتھ یعنی اُس کو شرمندگی ہوتی ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو توراضی کیا نہیں اور کہیں اللہ کے سامنے میری پکڑ نہ ہو جائے، کوئی ایسی بات نہ ہو جائے۔ جتنا اُس کو اللہ تعالیٰ سے تعلق ہوگا اتنی ہی اُس کو شرمندگی ہوگی اور اُتنا ہی اس کی پیشانی پر پسینہ آجائے گا۔

محدثین نے اس کی تفسیر یہ لکھی ہے کہ پیشانی پر پسینہ آنے کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ اللہ کے دربار میں حاضر ہو رہا ہے تو اِس کا احساس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دنیا میں کیوں بھیجا تھا اور مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟ میں نے کیا کیا؟ میں نے اتنی عظمت والے اللہ کی کوئی عبادت نہیں کی، میں نے اللہ تعالیٰ کے دین کی کوئی خدمت نہیں کی، اس احساس سے آدمی شرمندہ ہوتا ہے اور اسی شرمندگی کی وجہ سے پسینہ آجاتا ہے۔

مومن اور کافر کی روح نکلنے کی کیفیت

اللہ تعالیٰ پانچ سو فرشتوں کو عام مؤمن کی طرف بھیج دیتے ہیں کہ اس کو خوشخبری اور تسلی دو، یہ میرے پاس آرہا ہے، اس کے دل سے ڈر اور خوف نکالو، اس سے کہو کوئی فکر کی بات نہیں۔ ہر ایک فرشتہ ایسی خوشخبری دیتا ہے کہ دوسروں نے نہیں دی۔ جب پانچ سو فرشتے

---

[1]: سنن ترمذی:۹۹۸۔

اس طرح کی خوشخبری دیتے ہیں تو پھر روح نکلنے کے لیئے پھڑکتی ہے۔ جب فرشتے روح کو آنے کے لیے کہتے ہیں تو وہ فوراً آجاتی ہے۔[1]

کافر کے ساتھ اس کے بالکل برخلاف ہوتا ہے۔ پانچ سو فرشتوں میں سے ہر فرشتہ ڈرانے والی ایسی بات کہتا ہے کہ دوسرا فرشتہ نہیں کہتا۔ جب ملک الموت کافر کی روح نکالنے کے لیے آتے ہیں تو ملک الموت اُس کے پیر کو مارنا شروع کرتے ہیں، پھر اُس کے چہرے پر مارتے ہیں، پھر دبر پر ماتے ہیں، اس طرح اُس کی جان نکلتی ہے۔ اس کی روح کو ایسا کھینچتے ہیں جیسے کانٹے پر ڈالے ہوئے کپڑے کو کھینچا جاتا ہے۔[2]

ولی کی فضیلت

قرآن پاک میں ولیوں کی فضیلت ہے۔ حدیث پاک میں ان کے بارے میں بڑی عجیب و غریب باتیں آئی ہیں۔ فرمایا:

مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ[3]

جس نے میرے ولی سے دُشمنی کی تو میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ کس میں اتنی ہمت ہے اور اللہ سے لڑنے کے لیے کون تیار ہے؟ اس وجہ سے لکھا ہے کہ عمومی عذاب اُس وقت تک نہیں آتا جب تک کہ وہ بستی والے کسی اللہ والے سے مل کر نہ گزاریں، قرآن و حدیث میں دو آدمیوں کے ساتھ اعلانِ جنگ ہے ایک سود کھانے والے کے ساتھ[4] اور دوسرے اللہ کے ولی کے ساتھ دُشمنی کرنے والے کے ساتھ، ان کے بارے میں حکم ہے کہ اللہ کی ان سے کھلی جنگ ہے۔

۱: در منثور:۸ / ۳۲۔ ۲: تفسیر ابنِ کثیر: ۲ / ۶۵۳۔ ۳: صحیح البخاری:۶۵۰۲۔ ۴: البقرۃ:۲۷۹۔

اب سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اللہ کا خاص ولی کیا ہوتا ہے؟ ایک ولایتِ عامہ ہے جو اللہ کے کرم سے سب کو حاصل ہے اور ایک ولایتِ خاصہ ہے۔ ان دونوں میں بہت غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اور اس بارے میں پوری اُمت بہت زیادہ تذبذب کا شکار ہے۔ ان شاء اللہ اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کروں گا۔ ہم سب کو کوشش کرنی چاہیے کہ ہم ولایتِ عامہ سے آگے بڑھیں تاکہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی ولایتِ خاصہ حاصل ہو۔ جتنے بھی انوار ہیں اسلام کا نور، توفیق کا نور، سنتوں کا نور، اللہ کی یاد کا نور، مباحات سے بھی اپنے آپ کو بچانے کا نور، یہ مختلف انوارات ہوتے ہیں، جب آدمی کو تمام انوارات ملتے ہیں تب وہ ولایتِ کاملہ یا ولایتِ تامہ حاصل ہوتی ہے اور اس کو ولایتِ خاصہ بھی کہتے ہیں۔ یہ حاصل کیسے ہوتی ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے آثار کیا ہیں؟ اس کی تدبیر کیا ہے؟ ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ اس کو عرض کروں گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی ولایتِ عامہ کے ساتھ ولایتِ خاصہ سے بھی سرفراز فرمائے۔

مسئلہ ولایت کو تفصیلاً ذکر کرنے کا سبب

ولایت سے متعلق چند باتیں پہلے عرض کی گئی ہیں اور یہ بہت تفصیلی مضمون ہے۔ اس کے بیان کرنے کے دو مقاصد ہیں۔ ایک یہ کہ لوگوں کے ذہنوں میں اس مضمون سے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں وہ دُور ہوں اور ولایت کی حقیقت معلوم ہو۔ دوسرا یہ کہ ولایت کو حاصل کرنے کی کوشش ہر مسلمان کو کرنا چاہیے چونکہ ولایت کمائی جانے والی چیز ہے۔ آپ جس درجے کی ولایت اپنی محنت و کوشش سے حاصل کرنا چاہیں اللہ تعالیٰ اُسی درجے کی ولایت دیں گے۔ اور جو جتنے بڑے درجے کی ولایت حاصل کرے گا اللہ تعالیٰ اُس سے اتنا زیادہ خوش ہوں گے اور آخرت میں اُسی اعتبار سے اُس کو درجات ملیں گے۔

دنیا میں جو مکان بنانا چاہتا ہے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ مکان بنانے کی کوشش کرتا ہے، جو پیسے کمانا چاہتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ پیسے کمانے کی کوشش کرتا ہے، جو کار خریدنا چاہتا ہے وہ بہتر سے بہتر کار کو ترجیح دیتا ہے، یہی حال ولایت کا ہے کہ آخرت کے اعتبار سے آدمی جس درجے کی کوشش اور مجاہدہ کرے گا، حق تعالیٰ شانہ، اُس درجے کی ولایت دیں گے۔

جب اصطلاح میں ایمان والوں کے لئے ولی کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے خاص ولی مراد ہوتے ہیں۔ ہر کسی کو ولی نہیں کہتے۔ یوں تو اللہ تعالیٰ کی ولایت سب کو حاصل ہے۔ جب بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے عام مسلمان مراد نہیں ہوتے یا اس سے عام درجے کا ایمان اور عام درجے کا تقویٰ مراد نہیں ہوتا بلکہ اعلیٰ درجے کا ایمان اور اعلیٰ درجے کا تقویٰ مراد ہوتا ہے۔ آج کی اس نشست میں ولایتِ خاصہ کی تھوڑی سی وضاحت کرنے کی کوشش کروں گا۔ ولایت میں ہوتا کیا ہے؟ ولایت حاصل کیسے ہوتی ہے؟ اس ولایت کو حاصل کیا جاسکتا ہے یا نہیں کیا جاسکتا؟ ولایت حاصل کرنے کا حکم ہے یا نہیں ہے؟ بہت سے لوگ اس معاملے میں تذبذب کا شکار ہیں، یہ بات تھوڑی وضاحت طلب ہے۔

لوگ تذبذب کا شکار اس لیے ہیں کہ اس سلسلہ میں اُمت کے دو طبقے پائے جاتے ہیں۔ ایک طبقہ ولایت اور ولیوں کی باتوں کو بالکل نہیں مانتا اور کہتا ہے کہ جو کچھ بھی ہے وہ قرآن و حدیث ہے، پتہ نہیں ان صوفیوں نے کہاں سے یہ واہیات نکال دی ہیں۔ دوسرا طبقہ اولیاء کو ماننے والوں میں غالی قسم کا ہے۔ جاہل صوفیوں کا طبقہ یہ کہتا ہے کہ قرآن و حدیث میں ظاہری مسائل ہیں، تصوف کوئی اور چیز ہے، اس کا تعلق علمِ باطن سے ہے، یہ صرف سینہ بہ سینہ چلتا ہے۔ یہ دونوں طبقات غلط ہیں۔ ایک نے ولایت کو چھوڑا اور دوسرے نے قرآن و حدیث کو چھوڑا، دونوں غلطی پر ہیں۔

جو اولیاء کو نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ صوفیوں نے واہیات قسم کی چیزیں نکالی ہیں، یہ لوگ بھی غلط ہیں کیونکہ قرآن وحدیث میں صرف نماز روزے کا حکم نہیں ہے۔ اسکی کبھی وضاحت کروں گا کہ قرآن وحدیث میں کن کن چیزوں کا حکم ہے۔

ایمان وتقویٰ میں کمال حاصل کرنے کا ثمرہ

اس کی اصل یہ ہے کہ جب آدمی اپنے ایمان و تقویٰ میں کمال پیدا کرتا ہے تو حق تعالیٰ شانہ، اُس کو اپنا ایک قربِ خاص عطا فرماتے ہیں اور اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا حاصل ہو جاتی ہے۔ قربِ خاص کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُس پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہوتا ہے اور اُس کے قلب میں اللہ تعالیٰ کی طرف ایک کشش ڈال دی جاتی ہے۔ ولایت اللہ تعالیٰ بندے کو دیتے ہیں، بندہ اس کو لیتا نہیں ہے بلکہ بندہ صرف اس کے اسباب اختیار کرتا ہے۔ جب بندہ تقویٰ اختیار کرنے میں اور احکام کو بجالانے میں مجاہدہ وکوشش کرتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اُس کے مجاہدات سے خوش ہوکر اُس کے قلب میں اپنی طرف سے ایک کشش داخل فرمادیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو راضی کرنے والے سارے کام اُس کے لیے آسان ہو جاتے ہیں اور اُن سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اُسی میں اُس کو راحت ملتی ہے۔ اور جتنے کام اللہ تعالیٰ کی نامرضیات میں سے ہیں اُن سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے، اُن کا کرنا انتہائی گراں ہوتا ہے، جان چلی جائے لیکن آدمی ایسے کام کے کرنے کی ہمت نہیں کرتا۔ یہ کیفیت دل میں آجاتی ہے۔ اسی کا نام وصول اور نسبت مع اللہ ہے۔ اسی کو ولایتِ خاصہ کہتے ہیں۔

وصول اور نسبت مع اللہ

کہتے ہیں کہ آپ بہت پہنچے ہوئے آدمی ہیں۔ "پہنچے ہوئے" کی عربی ''وصول'' ہے۔ اس "پہنچنے" سے کیا مراد ہے؟ ایک معنی ہے ایک چیز کا دوسری چیز سے مل جانا یہاں یہ معنیٰ مراد

نہیں لے سکتے کیونکہ زمین والے کا آسمان والے سے مل جانا، ایسا ہو نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

اللہ تعالیٰ جسم سے سبحان ہیں

اللہ تعالیٰ کا جسم ہی نہیں ہے تو جسم والا وہاں تک کیسے پہنچے گا؟ اللہ تعالیٰ جسم سے سبحان ہیں، سبحان میں یہ بات داخل ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جسم نہیں ہے۔ جسم کی ایک صفت محدود ہونا ہے۔ چاہے آپ چھوٹا جسم مانیں یا بڑا جسم مانیں، چاہے آدمی کا جسم مانیں یا جبرئیل کا جسم مانیں، جو بھی جسم ہو گا وہ محدود ہو گا، اُس جسم کی اوپر نیچے دائیں اور بائیں جہتیں ہو جائیں گی جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات لا محدود ہے، اُس میں حد نہیں ہے، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ جسم سے بھی سبحان ہیں۔ سبحان میں یہ ساری چیزیں آ گئیں۔ جسم پہلے نہیں تھا بعد میں آیا جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پہلے سے ہے۔ جسم پر مختلف قسم کے عوارضات طاری ہوتے ہیں کہ وہ موٹا ہے یا پتلا ہے، اچھا ہے یا خراب ہے، پھر ان تمام چیزوں کا اللہ کے لیے ماننا لازمی ہو جاتا ہے۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ جسم ہی سے سبحان ہیں۔ ایک چیز دوسری چیز سے جا کر مل جائے ایسا نہیں ہوتا۔ پہنچنے کے دوسرے معنی قریب ہونے کے ہیں، قریب ہونا ایمان والوں کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ علم کے اعتبار سے ہر مخلوق سے قریب ہیں۔

وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ [1]

ہم مخلوق سے اُس کی شہ رَگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

اس سے پہلے میں نے آیۃ الکرسی میں "قیومیت" کی تفسیر میں عرض کیا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کیونکر اور کس نوعیت سے قریب ہیں۔ ہمارے والد صاحب کے ایک خلیفہ فرمایا کرتے

---

[1] ق:١٦۔

تھے اللہ تعالیٰ اس درجے قریب ہیں کہ اگر آدمی ہاتھ ڈال کر دیکھے تو سوائے اللہ تعالیٰ کے کچھ نہیں ملتا۔ اصل میں یہ حدیث ہی کا مفہوم ہے۔

ایک مرتبہ حضور ﷺ نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے پوچھا: "اوپر کیا ہے؟" عرض کیا: "بادل ہیں۔" دریافت فرمایا: "اُس سے اوپر کیا ہے؟" عرض کیا: "آسمان ہے۔" "اُس سے اوپر کیا ہے؟" "کرسی ہے۔" "اُس سے اوپر کیا ہے؟" "عرش ہے۔" "اُس سے اوپر کیا ہے؟" "اللہ ہے" (جیسے عام فہم ہوا کرتی ہے)

پھر دریافت فرمایا: "نیچے کیا ہے؟" عرض کیا: "زمین ہے۔" "اس سے نیچے کیا ہے؟" "زمین ہے۔" (جیسے سات آسمان ہیں ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے سات زمینیں بنائی ہیں) اس کے بعد حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اگر ایک رَسّی چھوڑی جائے اور وہ ساتوں زمینوں کو پار کرتی ہوئی آگے چلی جائے تو وہ رَسّی سیدھی اللہ تعالیٰ کے پاس جائے گی یعنی اوپر نیچے سب جگہ اللہ ہی ہیں۔"[1]

قرب سے مراد

غرض یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سب سے قریب ہیں۔ کافروں اور مشرکوں سے بھی قریب ہیں اور ایمان والوں سے بھی قریب ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ قریب نہ رہیں تو مخلوق کا وجود ہی نہ رہے۔ اس سے وہ قرب بھی مراد نہیں ہے جو اللہ والوں کو حاصل ہوتا ہے جس کو پہنچنا کہتے ہیں۔ پھر قرب سے کیا مراد ہوتا ہے؟ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی رضا اور خاص قسم کا تعلق ہے یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ خوش ہوتے ہیں اور اولیاء کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف محبت والی لپک ہوتی ہے کہ جس سے اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں بس وہی چیز اُن کی محبوب ہو جاتی ہے بلکہ اُن

---

[1]: سنن الترمذی: ۳۶۱۱۔

کی طبیعت بن جاتی ہے اور جس سے اللہ تعالیٰ کو نفرت ہوتی ہے اُس سے اُن کو نفرت ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت میں اُن کی محبت داخل ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نفرت اور ناراضگی میں اُن کی نفرت وناراضگی بھی داخل ہو جاتی ہے۔

ایک بزرگ کا قصہ ہے۔ لوگوں نے ان سے پوچھا: "کیا حال ہے؟"

انہوں نے کہا: "اس آدمی کا کیا حال پوچھتے ہو جس کی مرضی سے پوری کائنات چل رہی ہے؟" سب پریشان ہو گئے کہ آپ اپنے آپ کو اتنا بڑا سمجھ رہے ہیں کہ پورا نظامِ کائنات آپ ہی سے چل رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ تو پھر کس سے چل رہا ہے؟ لوگوں نے پوچھا کہ حضرت! اس کا کیا مطلب ہے؟

فناء فی اللہ کی حقیقت

انہوں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنا ارادہ بالکل فنا کر دیا ہے جو اللہ کی مرضی وہ میری مرضی، جو اللہ کی نامرضی وہ میری نامرضی لہٰذا جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ کی مرضی سے ہو رہا ہے تو وہ میری ہی مرضی سے ہو رہا ہے۔ ایک مقام پر اتنی فنائیت آجاتی ہے۔

ایک بزرگ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کہنے لگے: "سُبۡحَانِیۡ مَا اَعۡظَمَ شَانِیۡ"، میں کتنا عمدہ ہوں اور میری کیا شان ہے؟ (یہ کلمات اللہ کے لیے کہے جاتے ہیں: سُبۡحَانہٗ مَا اَعۡظَمَ شَانُہٗ) مریدین نے کہا کہ ہمارا پیر کام سے گیا، اس نے یہ کلمات کہہ دیے ہیں، اب تو ان کا ایمان بھی باقی نہیں رہا۔ جب اُن کو افاقہ ہوا تو لوگوں نے کہا کہ حضرت! آپ کو معلوم ہے آپ کیا کہہ رہے تھے؟ انہوں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم میں کیا کہہ رہا تھا۔ لوگوں نے کہا کہ آپ سبحانی ما اعظم شانی کہہ رہے تھے، یہ تو کلماتِ کفر ہیں۔ کہنے لگے کہ ہاں بھئی! میں توبہ کرتا ہوں، یہ تو کلماتِ کفر ہیں، اگر آئندہ کبھی میری زبان سے یہ الفاظ نکلیں تو تم میری گردن مار دینا۔

دوسری مرتبہ اُن پر پھر حال طاری ہوا۔ پھر دوبارہ انہوں نے کہہ دیا "سُبۡحَانِیۡ مَا اَعۡظَمَ شَانِیۡ"۔ مریدین نے شیخ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے مارنا شروع کر دیا۔ مریدین شیخ کو مارتے تھے لیکن اُس کا اثر مریدین کو ہوتا تھا۔ جب شیخ کو افاقہ ہوا تو دیکھا کہ سب لوگ زخمی ہیں۔ پوچھا کہ کیا ہوا؟ مریدین نے کہا کہ حضور! آپ ہی نے مارنے کی نصیحت کی تھی، ہم لوگوں نے آپ کی پٹائی کی لیکن مار ہم لوگوں کو لگ رہی تھی۔ کہنے لگے کہ اب آپ لوگ سمجھ گئے، میں ناقل ہوں، قائل نہیں ہوں۔ مجھ پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے اور اس کیفیت میں میں بات کو نقل کرتا ہوں، اپنی طرف سے نہیں کہتا ہوں، کوئی اور کہتا ہے۔

جیسے کسی پر جن چڑھ جائے تو وہ اس قسم کی باتیں کرتا ہے۔ زبان تو اُسی کی ہوتی ہے جس پر جن چڑھا ہے، لیکن بولتا جن ہے۔ بعض مرتبہ ایسی کیفیت مخلوق پر طاری ہو جاتی ہے۔ تو اللہ تبارک و تعالیٰ جس بندے سے راضی اور خوش ہو جاتے ہیں اُس بندے کو قربِ خاص (رضا) حاصل ہو جاتی ہے۔

مجنون اور مجذوب میں فرق

لیکن بعض مرتبہ بندہ پر حق تعالیٰ کی غیبی چیزوں کا ظہور ہوتا ہے جس کی وجہ سے بندہ کے ہوش اڑ جاتے ہیں، ہمیں نظر آنے والی کائنات کے علاوہ دوسری کائنات بہت زیادہ ہے، اس کا کوئی شمار ہی نہیں ہے؛ بلکہ کائنات میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی بنائی ہوئی حقیقتوں کو بیان کرنے کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں تو جب اللہ کے بندے پر کوئی غیبی چیز وارد ہوتی ہے تو بعض مرتبہ اس سے اتنا اثر ہو جاتا ہے کہ اُس کے ہوش ختم ہو جاتے ہیں، اسی کا نام "مجذوب" ہوتا ہے۔ مجنون اور مجذوب میں یہی فرق ہے۔ مجنون اُسے کہتے ہیں جس کے جسمانی بیماری کی وجہ سے ہوش ختم ہو چکے ہوں۔ اور کسی واردِ غیبی کی وجہ سے حق تعالیٰ کی

طرف سے علوم کے واردات، حقائق کے انکشافات کی وجہ سے بعض مرتبہ ایسے ہوتا ہے کہ آدمی اتنی حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ ہوش اُڑ جاتے ہیں، وہ مجذوب ہو جاتا ہے۔ وہ نہ دنیا کا رہتا ہے اور نہ دین کا رہتا ہے (اسے کچھ ہوش نہیں ہوتا)۔ مجذوب دنیا کا اس لیے نہیں رہتا کہ اُسے کھانے پینے اور رہنے کا ہوش نہیں رہتا اور دین کا اس لیے نہیں رہتا کہ اُس کی عقل باقی نہیں رہتی۔ جب اُس کی عقل باقی نہیں رہتی ہے تو پھر وہ کوئی کام نہیں کر سکتا، نماز اس سے معاف ہے، روزہ اُس سے معاف ہے، وہ کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط نہیں کرتا۔ مجذوب اللہ کا مقبول بندہ بن جاتا ہے مگر اُس کے ہاتھ میں کچھ نہیں رہتا جس کی وجہ سے اُس کے پاس نہ دنیا کا نفع ہوتا ہے اور نہ دین کا نفع ہوتا ہے۔

آپ لوگوں کو دیکھیں گے کہ مجذوبوں کے پیچھے پھرتے رہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی زبان سے جو نکل گیا وہ ہو جائے گا حالانکہ جو مجذوب کی زبان سے نکل گیا وہ نہیں ہوتا بلکہ جو ہونے والا ہوتا ہے وہ مجذوب کی زبان سے نکلتا ہے۔ اگر وہ بولے تب بھی ہو گا اور نہ بولے تب بھی ہو گا۔ مجذوبوں کے پاس دین کا فائدہ اس لیے نہیں ہے کہ دین کا فائدہ تعلیم و تعلّم پر منحصر ہے۔ جب مجذوب خود ہی ہوش نہیں رکھتا تو وہ آپ کی کیا تربیت کرے گا۔ دنیا کا فائدہ اس لیے نہیں ہے کہ وہ اپنے اختیارات کے اعتبار سے بالکل خالی ہو چکا ہوتا ہے اور اس پر انکشافات ہوتے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے لوگ مجاذیب کے پاس جانے سے منع کرتے ہیں۔ اور ان سے متعلق ایک بات یہ بھی ہے کہ اُن کی شان میں گستاخی اور بدتمیزی نہیں کرنا چاہئے کیونکہ وہ مقبولِ الٰہی ہوتے ہیں۔

یہ بہت باریک فرق ہے کہ کون مجذوب ہے اور کون مجنون ہے؟ کون ایسا ہے جو اللہ کی محبت میں دیوانہ ہو گیا ہے اور کون ایسا ہے جو جسمانی بیماری کی وجہ سے دیوانہ ہو گیا ہے، اس

فرق کو جاننا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اتنی بات ضرور دیکھی گئی ہے کہ اللہ کے خاص بندے مجذوبوں کی رعایت کرتے ہیں۔ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ مجذوبوں میں سے ہے۔ جو پاگل ہوتا ہے تو اللہ کے خاص بندے اس کی کوئی خاص رعایت نہیں کرتے۔

یہ بات مجھے اس بات پر یاد آگئی کہ جب اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے کسی بندے پر کشش ہوتی ہے، اس کشش کا اصل نام "وصول" (پہنچنا) ہے اور اس کا حاصل ہونا "ولایتِ خاصہ" کی علامت ہے۔ اس کا ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کی طبیعت اچھی چیزوں والی بن جاتی ہے اور جتنی بُری چیزیں ہیں اُس کی طبیعت اُن سے نفرت کرنے لگ جاتی ہے۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت زیادہ تھک جاتے تھے تو نماز پڑھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھکان کا علاج نماز تھی اور ہمارے پاس نماز تھکان کا باعث ہے۔

قُرَّۃُ عَیۡنِیۡ فِی الصَّلٰوۃِ[1]

میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے۔

اہل تعلق کے لیے ذکرِ الٰہی باعثِ انبساط

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں کھڑے ہوتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دن بھر کی تھکان کافور ہو جاتی۔ اہلِ تعلق جب اللہ کا نام لیتے ہیں تو تازگی آجاتی ہے اور ایک طرح کا انبساط پیدا ہو جاتا ہے۔ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرمانے پر غلام مانگا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو چند تسبیحات سکھائیں جن کو تسبیحاتِ فاطمہ بھی کہا جاتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر" پڑھا کرو اور فرمایا کہ یہ تسبیحات غلام سے بہتر ہیں۔[2] اہل اللہ کا تجربہ ہے کہ جو شخص سونے سے پہلے تسبیحاتِ فاطمہ پڑھ لے تو دن بھر کی تمام تھکان

۱: سننِ نسائی: ۳۹۳۹۔ ۲: صحیح البخاری: ۳۱۱۳۔

دُور ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے تعلق مع اللہ کی کیفیت کا ہونا چاہئے یعنی اللہ کا نام لینا غذا بن جائے۔ اور ایسا ہو گا بھی۔ دنیا کے اخیر وقت میں یہ ذکر لوگوں کی غذا بنے گا جیسے آخرت میں لوگوں کی غذا بنتا ہے۔

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں آئیں گے تو یاجوج ماجوج کے نکلنے کے بعد ایک وقت ایسا آئے گا جب مسلمان بڑے مصائب میں گھر جائیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی یاجوج ماجوج سے مقابلہ نہیں کریں گے اور فرمائیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ایسی مخلوق بنائی ہے جس سے مقابلے کی طاقت کسی میں بھی نہیں ہے۔ دجال کو مارنے کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے تشریف لائیں گے اور دجال کو مار بھی دیں گے لیکن یاجوج ماجوج کو نہیں ماریں گے اور فرمائیں گے کہ یاجوج ماجوج کا مقابلہ ہم نہیں کرسکتے۔ جب یاجوج ماجوج باہر آئیں گے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں کو لے کر پہاڑ پر چلے جائیں گے اور اُسی میں محصور ہو جائیں گے، وہاں سے یاجوج ماجوج کے لیے بددعا کرتے رہیں گے۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ اُس موقع پر مسلمانوں کے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں ہو گی اور گائے کا سر جو حضور ﷺ کے زمانے میں عام طور پر بیچا نہیں جاتا تھا، وہ سر سو دینار میں بکے گا۔[۱] اُس موقع پر اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے پیٹ "سبحان اللہ، الحمد للہ" سے بھریں گے۔[۲]

اور جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں تشریف لائیں گے تو وہ بھی آپ علیہ السلام کے پیروکار ہوں گے، نبی بہر حال نبی ہے لیکن وہ یہاں آکر اپنی نبوت کی اشاعت نہیں کریں گے بلکہ حضور ﷺ ہی کی نبوت کی اشاعت کریں گے مگر اُن کی نبوت منسوخ تھوڑا ہی ہو گئی۔ یہ قاعدہ یاد رکھ لینے کا ہے کہ نبوت ملنے کے بعد برخاست نہیں ہوتی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

۱: صحیح مسلم: ۷۵۶۰۔ ۲: سنن ابن ماجہ: ۴۰۷۷۔

اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں تو وہ پیغمبر ہی رہیں گے۔ حضور ﷺ کی شریعت کو پھیلائیں گے اور خود بھی حضور ﷺ کی شریعت کی پیروی کریں گے[۱] اُن کی صحبت میں ایمان والوں کے تعلق مع اللہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ اللہ کا نام لینے میں اُن کو لذت ملے گی اور اللہ تعالیٰ اُسی سے اُن کی بھوک و پیاس مٹا دیں گے۔ اس کا نام ولایتِ خاصہ ہے۔

پہلے میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اصل ولایت کس کو کہتے ہیں؟ ولایت ایمانِ کامل اور تقویٰ کامل سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی رضا اور اللہ تعالیٰ تبارک و تعالیٰ کی طرف خاص جذب اور کشش کے حاصل ہونے کا نام ہے اور آدمی کو اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا ایک احساس ہو جاتا ہے۔ یہ قرب ایک درجہ اعتقاد میں ہے جو ہم سب کو حاصل ہے۔ اللہ والوں کو یہ قرب درجۂ اعتقاد میں نہیں بلکہ درجۂ وجدان اور ذوق و حال کے اعتبار سے یہ کیفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ ایک ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ ہم سے قریب ہیں، اللہ ہم کو محیط ہیں، اللہ ہم کو گھیرے ہوئے ہیں، اللہ ظاہر ہیں، اللہ باطن ہیں، یہ ہر ایمان والے کا عقیدہ ہے۔ ایک اس کا وجدان و ذوق ہوا کرتا ہے۔ اللہ پاک مجاہدوں کی وجہ سے اپنے بندۂ خاص کو قرب اور نزدیکی عطا فرماتے ہیں جس کے نتیجے میں اللہ والوں کو وجدان اور ذوق و حال کے اعتبار سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی معیت حاصل ہو جاتی ہے۔

ولایت کی بنیاد

اس چیز کی بنیاد کیا ہے؟ ایمان کامل اور تقویٰ کامل۔ تقویٰ کامل کس چیز کا نام ہے؟ اعمال کی دو اقسام ہیں، ایک وہ اعمال جو انسان کے ظاہر سے متعلق ہیں، دوسرے وہ اعمال جو انسان کے باطن سے متعلق ہیں۔ اعمالِ ظاہری اور اعمالِ باطنی ان دونوں اعمال سے قرآن مجید بھرا ہوا

---

[۱]: صحیح مسلم: ۱۵۵۔

ہے۔ جیسے اعمالِ ظاہری فرض و واجب ہیں ایسے ہی اعمالِ باطنی بھی ہیں۔ باطن کے معنی اندرون کے ہیں۔ باطنی اعمال سے مراد دل اور نفس سے متعلق اعمال ہیں۔ اس کی تھوڑی وضاحت یہ ہے کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، حلال کمانا، حلال خرچ کرنا، صحیح طریقے سے شادی کرنا، اولاد کی تربیت کرنا، بیوی بچوں کے حقوق ادا کرنا وغیرہ یہ سب اعمالِ ظاہری ہیں۔ صبر، شکر، تقویٰ، اخلاص، للّٰہیت، تواضع، انکساری، توکل، رضا بالقضاء، تفویض، تسلیم، تقدیر پر راضی رہنا، عفت، شجاعت، عدل و انصاف وغیرہ اعمالِ باطنی ہیں، یہ تمام بھی ایسے ہی فرض ہیں جیسے نماز فرض ہے۔ قرآن پاک میں جتنی مرتبہ نماز کا ذکر ہے اُتنی ہی مرتبہ صبر و شکر کا بھی ذکر ہے۔

اعمالِ ظاہری میں کچھ، نہ کرنے کے بھی کام ہیں جیسے شراب نہ پینا، چوری نہ کرنا، زنا نہ کرنا، بدکاری نہ کرنا، سود نہ کھانا، رشوت نہ کھانا، کسی کا مال غصب نہ کرنا، کسی کی غیبت نہ کرنا، کسی کو گالی نہ دینا وغیرہ۔ ان کو منہیات بھی کہتے ہیں۔ ایک مسلمان کو ان تمام کاموں سے رُکنا ہے۔ اعمالِ باطنی میں بھی کچھ نہ کرنے کے کام ہیں جیسے دنیا کی محبت کا دل میں نہ ہونا، جاہ کی محبت کا دل میں نہ ہونا، مال کی محبت کا دل میں نہ ہونا، ریاکاری نہ ہونا، بے صبر اپن اور ناشکری نہ ہونا، طبیعت میں ظلم نہ ہونا وغیرہ۔ ان تمام اعمال کا بھی ایسا ہی حکم ہے جیسے چوری، زنا، بدکاری اور شراب پینے کی ممانعت ہے ایسے ہی ریاکاری کی ممانعت ہے، تکبر کی ممانعت ہے، عجب کی ممانعت ہے۔ شریعت کا ظاہری حصہ بھی بہت اہم ہے، اس کے بغیر آدمی اللہ کے قریب نہیں ہو سکتا اور شریعت کا باطنی حصہ بھی بہت اہم ہے، اس کے بغیر بھی آدمی اللہ کے قریب نہیں ہو سکتا۔ اس میں ایک بات یہ ہے کہ ظاہری حصہ اللہ کے یہاں اُسی وقت قبول ہے جب باطنی حصہ صحیح ہو جائے۔ اگر باطنی حصہ صحیح نہیں ہے تو ظاہری حصے کا اعتبار نہیں

ہے۔ اور باطنی حصہ صحیح ہے لیکن ظاہری حصہ صحیح نہیں ہے ایسا کبھی نہیں ہوتا کیونکہ جب باطن صحیح ہو گا تو ظاہر خود بخود صحیح ہو جائے گا۔

ظاہر و باطن سے متعلق ایک دھوکہ

کچھ لوگوں کو یہ بھی بیماری ہے کہ ظاہر سے کیا ہوتا ہے صرف دل اچھا ہونا چاہیے۔ علماء نے لکھا ہے کہ جو کچھ باہر ہو رہا ہے وہ دل کی چاہت سے ہو رہا ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ باطن میں کچھ نہ ہو اور ظاہر میں وہ ہو رہا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی عمل کے وجود سے پہلے جو عمل میں کر رہا ہوں، جو چیز میں دیکھ رہا ہوں، جو بات میں کہہ رہا ہوں یا سن رہا ہوں، یا جو میں پہن رہا ہوں، کھا رہا ہوں، جو کچھ ظاہر میں کر رہا ہوں پہلے اُس عمل کا ارادہ چاہیے، ارادے کے بغیر میں وہ کام نہیں کرتا۔ خود ارادے سے پہلے کسی بھی فعل اور عمل کو وجود میں لانے کے لئے چار درجات سے گذرنا پڑتا ہے ذِکر (یاد) چاہیے، اس سے پہلے اُس کی فکر چاہیے اور اُس سے پہلے اُس کی خواہش چاہیے۔ پہلے خاطر (خواہش) ہوتی ہے، خاطر کے بعد ذِکر ہوتا ہے، ذِکر کے بعد فکر ہوتی ہے، فکر کے بعد ھَمّ ہوتا ہے، ھَمّ کے بعد ارادہ ہوتا ہے، ارادے کے بعد کسی عمل کا وجود ہوتا ہے۔ کسی بھی عمل کے لیے یہ تسلسل لازم ہے، اس کے بغیر کوئی آدمی عمل نہیں کرتا۔ سب سے پہلے "خاطر" اسکا محل دل ہے، اصل عمل یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ دل میں ایک خواہش آتی ہے، دل یہ خواہش دماغ کو دیتا ہے، دماغ دل کا وزیر اعظم ہے اور دل بادشاہ ہے۔ دونوں میں اتنا قرب ہے کہ اصل سوچنے کا کام دل کرتا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ دماغ سوچ رہا ہے۔ قرآن میں یہ نہیں ہے کہ دماغ سوچتا ہے لیکن قرآن میں یہ ہے کہ دل سوچتا ہے:

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا [۱]

اُن کے پاس دل ہیں جس سے وہ سوچتے اور سمجھتے نہیں ہیں۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا [۲]

سو کیا یہ لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں جس سے ان کے دل ایسے ہو جائیں کہ اس سے سمجھنے لگیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ سوچنے کا کام دل کرتا ہے۔ دل میں ایک خواہش ہوتی ہے اور اُس کا اثر دماغ تک جاتا ہے۔ پھر دماغ پلاننگ کرتا ہے کہ یہ خواہش کیونکر پوری کی جائے۔ پھر وہ پورا منصوبہ بنا کر جوارح (اعضاء) کو دیتا ہے اور اُن سے کام لیتا ہے۔ پھر ہاتھ و پیر عمل کرتے ہیں۔ اگر کسی کا ظاہر بُرا ہے اور وہ یوں کہے کہ میرا باطن اچھا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اگر کسی کا باطن بُرا ہے اور ظاہر اچھا ہے تو ایسا ہو سکتا ہے کیونکہ باطن ابھی نہیں بنا۔ اسی وجہ سے ظاہر کے مقبول ہونے کے لیے باطن کا بننا ضروری قرار دیا گیا۔

ایک آدمی باطن کی خرابی کے ساتھ نماز پڑھتا ہے۔ مثلاً ریاکاری کرتا ہے۔ یہ سمجھ کر نماز پڑھتا ہے کہ میں اس لیے نماز پڑھتا ہوں کہ لوگ مجھے نمازی کہیں۔ اللہ کی محبت اور بندگی میں نہیں پڑھتا۔ یہ ظاہری طور پر نمازی ہے لیکن اللہ کے پاس بے نمازی ہے۔ جیسے بے نمازی جہنم میں جائے گا تو یہ نمازی بھی جہنم میں جائے گا۔ کوئی حج اس لیے کرتا ہے کہ لوگ کہیں گے کہ حاجی صاحب ہیں، مگر وہ اللہ کے پاس حاجی صاحب نہیں ہیں۔ جیسے کسی نے حج فرض ہونے کے باوجود حج نہیں کیا جیسے یہ جہنم میں جائے گا، ایسے ہی دوسرا اپنے باطن کو درست کیئے بغیر حج کرنے والا شمار نہ ہو گا۔ گویا اس نے بھی حج نہیں کیا ہے۔

۱: الاعراف: ۱۷۹۔ ۲: الحج: ۴۶۔

اعمالِ ظاہری وباطنی کی دوسری تعبیر

یہ دو قسم کے اعمال ہوتے ہیں اعمالِ ظاہری اور اعمالِ باطنی۔ اعمالِ ظاہری کا نام فقہ ہے اور اعمالِ باطنی کا نام تصوف ہے۔ اعمالِ ظاہری بہت طویل ہیں۔ جب کوئی چیز طویل ہو جاتی ہے تو اُس کے شعبے بنا دیے جاتے ہیں۔ پہلے کے ڈاکٹر سارے کام خود ہی کر لیا کرتے تھے، خود ہی فزیشن تھے، خود ہی علاج کرتے تھے، وہی ڈاکٹر پیروں، ہاتھوں اور جسم کے تھے لیکن جیسے جیسے اس شعبے کو ترقی ہوئی تو ہر ایک کا اسپیشلسٹ الگ الگ ہو گیا۔ اب جو آنکھوں کا اسپیشلسٹ ہے وہ پیٹ کو نہیں دیکھتا، جو ڈاکٹر پیٹ کا ہے وہ پیٹھ کو نہیں دیکھتا چونکہ ہر کسی کا کام اتنا طویل ہو گیا ہے کہ وہ دوسرے میں دلچسپی نہیں لے سکتا اور اگر اُس نے دلچسپی لی تو اپنے کام میں کامل نہیں ہو سکتا۔ خصوصیت جب ہی حاصل ہوتی ہے جب ایک چیز کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے۔ اعمالِ ظاہری میں جزئیات کے اجتہاد سے اتنی تفصیل ہو گئی کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن و حدیث پر غور کر کے جن فقہی مسائل کا استنباط کیا ہے اُن کی تعداد اَسّی ہزار ہے۔ اَسّی ہزار مسئلے اُن کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ جیسے یہ فقہی کام طویل ہو گیا، ایسے ہی اعمالِ باطنی سے متعلق جو فقہ اور مسائل ہیں اُن کا کام بھی طویل ہو گیا۔ اصل شریعت ظاہر اور باطن دونوں کا جاننا ہے۔ جب تک آدمی اللہ تعالیٰ کے ظاہری و باطنی تمام اعمال کو پورا نہیں کرے گا، اُس وقت تک اللہ تعالیٰ کا پورا فرمانبردار نہیں کہلائے گا۔ اسی لیے قرآن پاک میں ہے:

وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ[1]

جو گناہ ظاہری ہیں اُن کو بھی چھوڑو اور جو گناہ باطنی ہیں اُن کو بھی چھوڑو

---

[1]: الانعام: ۱۲۰۔

میرا دین اُس وقت کامل ہو گا جب میں اعمالِ ظاہری اور اعمالِ باطنی دونوں کے اعتبار سے مکمل ہو جاؤں گا ورنہ اُس وقت تک میں پورا دیندار نہیں ہو سکتا۔

باطنی اعمال سے متعلق فقہ اور مسائل کا نام "تصوف" ہے۔ اس کی کمزوریاں عام طور پر کسی کو سمجھ میں نہیں آتیں۔ اگر سمجھ میں بھی آجائیں تو اُن کو دُور کرنے کا طریقہ معلوم نہیں ہوتا۔ اگر کسی کو دُور کرنے کا طریقہ بھی معلوم ہو گیا تو نفس کی کشاکشی کی وجہ سے علاج نہیں کر سکتا کیونکہ ظاہری اعمال کے مقابلے میں باطنی اعمال میں نفس و شیطان بہت زیادہ دخل اندازی کرتے ہیں۔ اس وجہ سے آدمی کو ظاہری اعمال سے بھی زیادہ مجاہدہ باطنی اعمال میں کرنا پڑتا ہے۔ شریعت کے ان دونوں اعمال کو کامل طریقے سے لینے کے بعد آدمی کا ایمان اور تقویٰ اعلیٰ درجے کا ہو گا۔ اس کے بغیر دنیا متقی اور پرہیز گار سمجھے گی لیکن اللہ کے نزدیک اس کے بغیر وہ متقی اور پرہیز گار نہیں ہوتا۔ اب اندازہ لگائیے کہ ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے اُس میں کاملین کی کتنی کمی ہے۔ کامل ایمان والے بہت ہی کم ہوتے ہیں چونکہ کامل ایمان کامل اعمال سے بنتا ہے اور کامل اعمال ظاہری و باطنی تمام اعمال کے مکمل ہونے سے بنتے ہیں۔ جیسے ظاہری فقہ کے علماء ہیں ایسے ہی باطنی فقہ کے بھی علماء ہیں۔ ظاہری فقہ کے علماء کو علمائے ظاہر کہتے ہیں جبکہ باطنی فقہ کے علماء کو علماء باطن و مشائخ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ظاہر نظر آجاتا ہے اور اس کی بہت سی باتیں قرآن و حدیث میں واضح ہیں۔ اس میں بہت سے لوگ گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر کم ہی کر پاتے ہیں۔ باطن نظر نہیں آتا اس وجہ سے بہت سے لوگ گمراہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

دو نمبری علمائے ظاہر میں کم ہے لیکن علمائے باطن میں بہت زیادہ ہے۔ سجادہ نشین بن کر اپنا کاروبار چلا رہے ہیں۔ ذرّہ برابر کام نہیں آتا۔ جب آدمی باطنی فقہ سے واقف ہی نہیں ہے تو کسی کی کیا تربیت کرے گا۔ وہ کیا جانتا ہے کہ باطنی مسائل کیا ہیں، اُن کو کیسے حل کیا جاتا ہے۔

شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت

آپ یوں سمجھ لیجیے کہ شریعت ظاہری اور باطنی مسائل کا نام ہے۔ ان کو حاصل کرنے کا نام طریقت ہے۔ شریعت کو حاصل کرنے کے باضابطہ طریقے ہیں اور ان کا نام طریقت ہے۔ جب آدمی اُس کو اپناتا ہے تو اُس کی خرابیاں دُور ہو جاتی ہیں اور دل کی اچھائیاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے "ضیاء القلوب" میں فرمایا ہے کہ جب تک ظاہری اور باطنی اعمال صحیح نہیں ہوتے اُس وقت تک وصول اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے قربِ خاص کی استعداد ہی پیدا نہیں ہوتی۔ اس سے آپ سمجھ لیجیے کہ کوئی آدمی پیر یا شیخ بنا ہوا ہو لیکن ظاہری اعمال بگڑے ہوئے ہیں، نماز نہیں پڑھتا، زندگی سنت کے خلاف گزارتا ہے اور پیر بنا ہوا ہے، وہ صرف دھوکہ ہے، اُس کے پاس حقیقت نہیں ہے کیونکہ اُس میں وصول کی استعداد ہی نہیں آئی تو اُس کو وصول کہاں سے ہو جائے گا۔ اس کے بغیر وصول ہو ہی نہیں سکتا۔

پہلے آدمی علمائے کرام کے پاس جائے اور اپنے عقیدے درست کرے۔ پھر اس کے بعد اپنے معاملات، معاشرت اور اخلاق سب صحیح کرے۔ اپنی وضع قطع، شکل و صورت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ کی اصلاح ہو جانے کے بعد یعنی ظاہر بن جانے کے بعد جس کو شریعت سے تعبیر کیا جاتا ہے اب آدمی کو ان اعمال میں جان ڈالنے کے لیے باطن کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ پھر آدمی اپنے اندر سے ایک ایک چیز کو چن کر نکالتا ہے، ریاکاری نکالتا ہے، حبِ جاہ، حبِ مال، حبِ دنیا، حسد، کینہ، بغض، ظلم، دوسروں کو حقیر سمجھنا وغیرہ اپنے نفس میں

سے کرید کرید کر نکالتا ہے اور اپنے اندر اچھی صفات پیدا کرتا ہے اور ان اعمالِ باطنی کے طریقوں کو طریقت کہا جاتا ہے۔ اب ظاہر اور باطن دونوں آراستہ ہوگئے۔ جب یہ بات پیدا ہوتی ہے تب جاکر دل میں جِلا اور روشنی آتی ہے اور دل میں صفائی پیدا ہوتی ہے۔ اس صفائی کے حاصل ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس پر کچھ حقائق کھولے جاتے ہیں۔ ان حقائق کا نام "حقیقت" ہے۔ پہلے شریعت ہوتی ہے، شریعت کے بعد طریقت اور طریقت کے بعد حقیقت ہوتی ہے۔ جب آدمی شریعت والے طریقے پر چلتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اُس پر حقائق کھولتے ہیں۔ اس حقیقت کے کھلنے کا نام معرفت ہے۔ اس کے بعد آدمی عارف بنتا ہے۔ یہاں آکر آدمی کو ولایتِ خاصہ ملتی ہے۔

اولیاء اللہ کی اقسام

پھر اولیاء اللہ دو قسم کے ہو جاتے ہیں۔ ایک اہلِ تکوین ہوتے ہیں اور دوسرے اہلِ تشریع۔ اہلِ تشریع کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی اصلاح کرنا، رُشد و ہدایت کرنا، لوگوں کو بتانا وغیرہ، یہ ذمہ داری اہلِ تشریع سے متعلق ہوتی ہے۔ اہلِ تشریع میں سب سے بڑے درجے والے کو "قطب الارشاد" کہتے ہیں اور اسی کو "غوثِ اعظم" کہتے ہیں۔ یہ "غوثِ اعظم" عہدہ ہے۔

ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ "غوث" کے معنی کیا ہیں؟ میں نے کہا کہ مدد کرنے والا۔ پوچھنے لگے کہ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو غوث بولنا کیسا ہے؟ یہ سوال اسلیے پیدا ہوا کہ ایک طبقہ ایسا ہے جو حضرت عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو "غوث" بنانا جائز بتاتا ہے۔ اصل قصہ یہ ہے کہ غوث، قطب اور ابدال مراحل کے اعتبار سے عہدوں کے نام ہیں۔ قطب ایسے مقام پر ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں اُمت کی اصلاح اس سے متعلق ہوتی ہے اور پوری اُمت کے مولویوں سے جو مسئلہ حل نہیں ہوسکتا اُسے وہ حل کر دیتا ہے۔

حضرت عبد القادر جیلانیؒ کو "غوث" کا لقب ملنے کی وجہ

حضرت عبد القادر جیلانیؒ کو غوث کا لقب ایک مسئلے کے بعد ملا۔ ایک مسئلہ پر آکر سب لوگ پھنس گئے تھے۔ علماء نے بھی کہا کہ اس کا جواب ہمارے سمجھ میں نہیں آرہا۔ اُس وقت حضرت عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب بتایا۔ تب لوگوں نے اُن سے متعلق کہا کہ یہ شخص غوثیت کے مرتبے پر فائز ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں ایسی عبادت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ عبادت اِس وقت پوری دنیا میں کوئی بھی نہ کر رہا ہو۔ اگر اس وقت پوری دنیا میں کوئی وہ عبادت کرے تو میری بیوی کو طلاق۔ اب اگر وہ نماز پڑھے تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ اُس وقت پوری دنیا میں کوئی نماز نہ پڑھ رہا ہو۔ اگر وہ ذکر کر رہا ہے تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ اُس وقت پوری دنیا میں کوئی ذکر نہ کر رہا ہو۔ اب اگر اس کی بیوی کو طلاق سے بچانا ہے تو اس کی کیا صورت ہے؟ تمام علماء نے یہی کہا کہ اس کی کوئی صورت نہیں ہے، اس کی بیوی کو طلاق ہو ہی جائے گی۔ پھر لوگ مسئلہ لے کر حضرت عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچے۔ انہوں نے مسئلہ سن کر فرمایا کہ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ فرمایا کہ بیت اللہ میں پانچ منٹ کے لیے مطاف خالی کروادو اور بتادو کہ اس کی بیوی کی طلاق کا مسئلہ ہے، آپ لوگ تھوڑی دیر کے لیے رُک جائیں، پھر اس شخص کو بالکل قریب سے طواف کروادو اور سات چکر لگوانا بھی ضروری نہیں، صرف چار چکروں میں بھی طواف کی عبادت کا حکم لگ جائے گا، جو پانچ منٹ میں ہو جائیں گے اور طواف ایسی عبادت ہے جو پوری دنیا میں ایک ہی جگہ پر ہوتی ہے۔ جب یہ شخص طواف کر رہا ہو گا تو پوری دنیا میں یہ اکیلا ہی اس عبادت کو کر رہا ہو گا۔ تب پتہ چلا کہ دنیا میں یہ آدمی لوگوں کو مسئلے اور ہدایت بتانے کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ مقام پر

ہے، غرض یہ کہ اہل اللہ کی ایک قسم "اہلِ ارشاد" کہلاتی ہیں۔ اس میں سب سے بڑے درجے والا "قطب الارشاد" کہلاتا ہے۔

قطب التکوین

اولیاء اللہ کی ایک قسم اہل تکوین کی ہے "اہلِ تکوین" کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ہونے والے کام بھی اللہ تبارک و تعالیٰ اُن کے سپرد کرتے ہیں یعنی اُن میں فرشتوں والی صفت آجاتی ہے اور اللہ تعالیٰ جو کام فرشتوں سے لے رہے ہیں وہی کام اُن سے لیتے ہیں۔ پانی پر میکائیل علیہ السلام مقرر ہیں، جان کے نکالنے پر عزرائیل علیہ السلام مقرر ہیں، وحی کے لانے پر جبرئیل علیہ السلام مقرر ہیں، لوگوں کی حفاظت پر کچھ فرشتے مقرر ہیں، پہاڑوں پر کچھ فرشتے مقرر ہیں، جنگلوں میں کچھ فرشتے مقرر ہیں، بچوں کی حفاظت پر کچھ فرشتے مقرر ہیں، فرشتے مختلف کاموں میں لگے ہوئے ہیں کیونکہ قرآن پاک میں انہیں "مُدَبِّرَاتُ الْأَمْرِ" کہا گیا ہے۔[1] ایسے ہی اللہ تعالیٰ بعض بزرگوں اور اہل اللہ سے کام لیتے ہیں۔ اس میں بڑے درجے والے کو "قطب التکوین" کہتے ہیں۔

اہلِ تکوین کی مثال

آپ پوچھیں گے کہ اس بات کی کوئی اصل ہے؟ جی ہاں! اس کی اصل موجود ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام کا قصہ سورۂ کہف میں مذکور ہے، بہر حال حضرت خضر آدمی ہیں۔ وہ اہلِ تکوین میں سے ہیں۔ اکثر علماء کی رائے ہے وہ اس وقت بھی زندہ ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ وہ جہاد بھی کریں گے کیونکہ اُنہوں نے آبِ حیات پی لیا ہے۔[2] اُن کی موت سب سے آخر میں آئے گی جب اسرافیل علیہ السلام کی موت آئے گی، کیونکہ اسرافیل سب سے

۱: النازعات:۵۔ ۲: عمدۃ القاری:۳ / ۳۲۔

آخر میں مرنے والے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ اسرافیل علیہ السلام سے پوچھیں گے کہ سب ہلاک ہوگئے؟ وہ کہیں گے کہ سب ہلاک ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ کون بچا ہوا ہے؟ وہ کہیں گے کہ اے اللہ! میں ہی ایک بندہ بچا ہوا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو بھی مر جا۔ وہ بھی فنا ہوجائیں گے۔[۱] غرض یہ کہ حضرت خضر اہلِ تکوین میں سے ہیں یعنی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ کے حکم سے کرتے رہتے ہیں۔ مگر اہلِ تکوین کی وجہ سے وہ اہلِ اختیار نہیں ہوتے۔ جیسے فرشتوں کا کوئی اختیار نہیں رہتا۔ اس کو بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔ حضرت میکائل علیہ السلام پانی پر مقرر ہیں لیکن اُن کو کچھ بھی اختیار نہیں ہے۔ سب لوگ مل کر میکائل علیہ السلام سے کہیں کہ یہاں سیلاب آگیا ہے، اب مزید پانی مت برسایئے۔ لوگوں کے کہنے سے وہ تھوڑا ہی رُکنے والے ہیں، جتنا اُن کو برسانا ہے وہ تو برسائیں گے۔ یہ پانی روکنا اور بھیجنا اُن کے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ ایک ایک قطرے کے محافظ ہوتے ہیں، جتنا پانی اللہ تعالیٰ نے اُتارنے کو کہا اُسے اُتار کر چھوڑیں گے اور جتنا اللہ تعالیٰ نے روکنے کے لیے کہا اُتنا روک کر چھوڑیں گے۔

لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ[۲]

اللہ تعالیٰ نے اُنہیں جس بات کا حکم دیا ہے اُس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو کہا جاتا ہے وہی کرتے ہیں۔

اہلِ تکوین کے افعال کی حقیقت

چنانچہ خضر علیہ السلام کے اعمال حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس لیے ناگوار لگ رہے تھے کہ وہ بظاہر شریعت کے مخالف تھے اور اُن کے اختیار میں نہیں تھا کہ وہ اُن کی مخالفت کرتے۔ جب حضرت خضر علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ایک خادم تینوں کشتی میں سوار

۱: تفسیر ابنِ کثیر: ۳ / ۲۵۳۔ ۲: التحریم: ۶۔

ہوئے تو ان لوگوں کے صالح حلیے کو دیکھ کر کشتی والے نے ان تینوں سے کرایہ نہیں لیا جبکہ سب سے کرایہ لیا۔ اب خضر علیہ السلام نے سوراخ کر دیا۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جلال آگیا کہ یہ کیا ہے؟ آپ کو کم از کم دوسرے کی رعایت کرنی چاہیے تھی۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ آپ ہمارے کام میں گڑبڑ نہ کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ ٹھیک ہے، میں بھول گیا تھا۔ آگے چل کر حضرت خضر علیہ السلام نے اچھے خاصے نوجوان کے دو ٹکڑے کر دیے، ظاہراً اُس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ کسی آدمی کو ناحق مار دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام پھر دوبارہ غضبناک ہو گئے۔ آگے چلے تو بھوکے پیاسے تھے، کوئی کام نہیں ملا اور دیوار سیدھی کرنی شروع کر دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ کم از کم پیسے لے کر دیوار سیدھی کرتے تو ہم کھانا کھا سکتے تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ یہ تین مرتبہ ہو گیا اور آپ ہمیشہ اعتراض بھی کرتے رہیں گے۔ [1] میری اور آپ کی مناسبت ہونے والی نہیں ہے۔ ان کاموں میں سے کسی بھی کام کا تعلق تدبیر سے نہیں بلکہ تکوین سے ہے۔ دنیا میں کوئی کام کیوں ہونا چاہیے؟ کس وجہ سے ہوتا ہے؟ اس کی کیا حکمتیں ہیں؟ یہ حکمتیں اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں اور اللہ تعالیٰ جن کو یہ کام لگا دیتے ہیں وہ وہی کرتے ہیں، اپنے اختیار سے کوئی کام نہیں کرتے۔

اگر کسی اللہ والے کے بارے میں معلوم ہو کہ یہ اہلِ تکوین میں سے ہے اور لوگ اُن کے پاس جا کر کہیں کہ میرا یہ کام بنا دیں تو اہلِ تکوین اپنے اختیار سے کچھ نہیں کرتے حتیٰ کہ اہلِ تکوین دُعا بھی نہیں کرتے، کیونکہ اُن کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت و حکمت کے تحت کون سا کام ہونے والا ہے اور کون سا کام نہیں ہونے والا ہے۔

---

[1]: الکہف: ۶۰ تا ۸۰۔

خود حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ موسیٰ پر رحم کرے اگر صبر کر لیتے تو اور عجائباتِ خداوندی نظر آتے۔[1] لیکن چونکہ اُن کے سارے کام ہو گئے تھے۔ جیسے کشتی میں سوراخ کر دیا تو اس میں فائدہ کشتی والے کا تھا کیونکہ اگر کشتی صحیح و سالم رہتی تو بادشاہ قبضے میں لے لیتا۔ کشتی عیب دار ہونے کی وجہ سے انہی کے ساتھ رہ گئی اور اس کا ذریعۂ معاش محفوظ رہا۔

جو بھی کام ہو آدمی کو چاہے اُس میں نقصان نظر آئے یا فائدہ تو اُسے کیا کرنا چاہیے ؟ آدمی کو اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہنا چاہیے اور یہی سمجھنا چاہیے کہ اللہ پاک حکمت والے ہیں، جو کچھ بھی انہوں نے کیا ہے وہ حکمت ہی سے کیا ہے۔ بظاہر وہ کشتی والا بھی ناراض ہو گیا مگر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُس کی حفاظت اسی نقصان میں رکھی تھی۔ ایسے بہت سارے واقعات پیش آتے ہیں۔

ایک وزیر کا واقعہ

ایک قصہ عام طور پر سنایا کرتا ہوں کہ ایک وزیر کی عادت تھی کہ وہ ہر کام پر یہ مقولہ کہا کرتا تھا کہ جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ ایک مرتبہ بادشاہ کی اُنگلی کٹ گئی تو وزیر کی زبان سے نکل گیا کہ اچھا ہوا۔ بادشاہ یہ سن کر ناراض ہو گیا کہ ایک تو ہماری انگلی کٹ گئی اور تم کہہ رہے ہو اچھا ہوا، یہ کیا بدتمیزی ہے لہٰذا اس کو جیل میں ڈالو۔ وزیر صاحب کو جیل میں ڈال دیا گیا، اُس نے کہا کہ جو کچھ بھی ہوا اچھا ہوا۔ وزیر صاحب جیل میں تھے، بادشاہ شکار کے لیے چلا گیا۔ جب بہت آگے چلے گئے تو تھک گئے۔ آرام کے لیے ایک درخت کے نیچے لیٹ گئے۔ اتنے میں ایک شیر آ گیا۔ شیر کو دیکھ کر بادشاہ کی جان میں جان ہی نہیں رہی۔ شیر قریب آ گیا۔ بادشاہ اس طرح ہو گیا جیسے مر گیا ہو۔ شیر کی خصوصیت یہ ہے کہ کسی کا شکار کیا ہوا نہیں کھاتا یعنی اُس کی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ دوسرے کا کھائے۔ شیر نے بادشاہ کو سونگھنا شروع کیا۔ سونگھتے

---

[1]: صحیح البخاری: ۱۲۲۔

سونگھتے شیر کی ناک بادشاہ کی کٹی ہوئی انگلی پر لگی تو شیر بادشاہ کو کسی اور کا شکار کیا ہوا سمجھ کر چھوڑ کر چلا گیا۔ جب شیر دُور چلا گیا تو بادشاہ کی جان میں جان آئی۔ پھر بادشاہ واپس ہوا اور تمام راستے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہا کہ آپ نے جان بچالی۔ بادشاہ سوچتا رہا کہ وزیر نے انگلی کٹنے پر کہا تھا کہ جو ہوا اچھا ہوا، اگر میری انگلی کٹی ہوئی نہیں ہوتی تو آج شیر مجھے شکار کر لیتا۔ محل پہنچ کر وزیر کو جیل سے بلوایا اور کہا کہ تمہاری بات بالکل صحیح تھی کہ جب میری انگلی کٹ گئی تھی تو تم نے کہا تھا کہ جو ہوا اچھا ہوا، یہ بات تو میری سمجھ میں آگئ لیکن جب میں نے تم کو جیل میں بھیجا اور تم نے کہا کہ جو ہوتا ہے اچھا ہوتا ہے، یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ وزیر نے کہا کہ اگر میں جیل میں نہیں ہوتا تو میں آپ کے ساتھ ہوتا اور آپ ہی کے پاس لیٹا ہوا ہوتا اور میری اُنگلی تو کٹی ہوئی نہیں تھی، اللہ تعالیٰ نے میری جان جیل بھیج کر بچائی اور آپ کی جان اُنگلی کاٹ کر بچائی۔

افعالِ باری تعالیٰ حکمت سے خالی نہیں

کائنات میں مخلوق کے ساتھ جو بھی کام ہو رہا ہے اُس میں حکمت ہوتی ہے۔ اس وقت مسلمانوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ بوسنیا میں کیا نہیں ہو رہا ہے، عراق میں کیا نہیں ہو رہا ہے، رُوس و چین میں کیا نہیں ہو رہا ہے، صومالیہ میں کیا نہیں ہو رہا ہے۔ لیکن ہماری آنکھیں اُس چیز کو نہیں دیکھتیں جو اللہ تبارک و تعالیٰ کا علم دیکھتا ہے کہ اس میں مسلمانوں کے ساتھ کیا حکمت ہے۔

جب میں چین کے سفر سے واپس آیا تو مفتی نصیر احمد صاحب سے ملنے کے لیے گیا۔ اُن کو چائنا کے مسلمانوں پر کئے گئے مظالم سنائے، کہ ہزاروں علماء اور مسلمانوں کو کس طرح قتل کیا گیا۔ تھوڑی دیر سنتے رہے، پھر فرمایا کہ تم نے اس کو کیا سمجھا؟ میں نے کہا کہ بڑے افسوس کی

بات ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس میں افسوس کی کیا بات ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے کام ہیں، وہ بہتر جانتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اس میں کیا بات سمجھ میں آتی ہے؟ کہنے لگے کہ کیا یہی بات سمجھنا کم ہے کہ یہ لوگ اپنے اعمال سے شہادت کے رُتبے کو پا نہیں سکتے تھے، مسلمان ہو کر شراب پی رہے ہیں، جوا کھیل رہے ہیں، نمازیں نہیں پڑھ رہے ہیں تو ان سے کیا توقع تھی کہ یہ لوگ بڑے مرتبے حاصل کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن پر کافروں کو مسلط کیا، انہوں نے مسلمانوں کی گردنیں کاٹیں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں شہادت کا مقام دے دیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان جہاں کہیں بھی شہید ہو رہے ہیں تو اُس پر ہم خوش ہوتے رہیں۔ مگر جو کچھ ہو رہا ہے اُس کے پیچھے یقیناً کوئی بات ہے۔

پوری دنیا کے انسانوں کی نجات کی کنجی ہمارے پاس ہے یعنی مسلمانوں کے پاس ہے۔ کوئی بھی انسان مسلمان ہوئے بغیر نجات نہیں پا سکتا اور مسلمان یہ کنجی غیر مسلموں کو دینے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ اس طرح مسلمان غیر مسلموں کی آخرت برباد کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان غیر مسلموں سے بھی محبت فرماتا ہے:

اَلْخَلْقُ عَيَالُ اللهِ [1]

پوری مخلوق اللہ تعالیٰ ہی کا کنبہ یا خاندان ہے۔

اس فرض کو مسلمان ادا نہیں کر رہے ہیں جس کے بغیر ہزاروں لاکھوں لوگ روزانہ مر رہے ہیں اور اللہ کے ضابطے کے مطابق وہ لوگ جہنم رسید ہو رہے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ ضابطہ بنا دیا ہے کہ میں مشرک اور کافر کو نہیں بخشوں گا۔ جتنے لوگ بغیر کلمے اور ایمان کے

۱: شعب الایمان: ۷۰۴۵۔

مر رہے ہیں ان لوگوں کی ذمہ داری اُن لوگوں پر عائد ہوتی ہے جن کے پاس یہ امانت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ایک ایک عمل میں ہزاروں لاکھوں مصلحتیں ہوتی ہیں۔

میں یہ بات اس پر عرض کرنے لگا ہوں کہ جیسے اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کام لیتے ہیں ایسے ہی اپنے بعض نیک بندوں کو کام لگادیتے ہیں۔ جن کو کائنات سے متعلق ذمہ داریاں سونپی جاتی ہیں ایسے لوگوں کا نام "اہلِ تکوین" ہوتا ہے۔ لوگوں کو رُشد و ہدایت اور سیدھے راستے پر لانے کا کام جن سے متعلق ہوتا ہے اُنہیں "اہلِ ارشاد" کہتے ہیں۔ اہلِ ارشاد میں سے جو سب سے بڑے ہوتے ہیں ان کو "قطب الارشاد" اور اہلِ تکوین میں سے جو سب سے بڑے ہوتے ہیں ان کو "قطب التکوین" کہتے ہیں۔ یہ تمام عارفین صاحبِ شریعت، صاحبِ طریقت اور صاحبِ حقیقت ہوتے ہیں مگر ان تمام باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی اس بات کا ذمہ دار ہوتا ہے کہ اپنے کسب سے اپنے اعمالِ ظاہری اور اعمالِ باطنی کو درست کرے، جب آدمی کوشش کرکے اس کے لیے اپنے دل کی زمین ہموار کرلیتا ہے تو حق تعالیٰ کا فیضان اُس کے قلب کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ اپنا قرب خاص نصیب فرماتے ہیں۔

ولایت اور بزرگی کا مقصودِ اصلی

میں نے ایک بہت بڑے محقق کی تصوف کی کتاب میں دیکھا ہے کہ بندے کی طرف سے ولایت اور بزرگی میں اصل مقصود کیا ہوتا ہے؟ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اصل مقصود کیا ہے؟ بندے کی طرف سے اصل مقصود دو چیزیں ہیں ایک ہے دوامِ حضور اور دوسرا ہے دوامِ طاعت۔ دوامِ حضور کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اوپر اتنی مشق کرنا کہ بندہ ہر وقت اپنے آپ کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے محسوس کرنے لگے۔ یہ چیز مشق سے حاصل ہوجاتی ہے۔ جب آدمی مشق کرتا ہے تو اُس کو یہ ملکہ حاصل ہوجاتا ہے کہ اگر وہ نوکری کررہا ہے، کاروبار کررہا

ہے، بیوی بچوں سے باتیں کر رہا ہے مگر اُس کا دل و دماغ اللہ تعالیٰ کی طرف لگا ہوا ہے۔ دوامِ طاعت کا مطلب یہ ہے کہ ظاہر و باطن میں ہر عمل اللہ تبارک و تعالیٰ کے حکم کے موافق کرنا چاہے فائدہ ہو یا نقصان۔

جب بندے کی طرف سے یہ دو چیزیں پائی جاتی ہیں جو اصل مقصود ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو چیزیں حاصل ہوا کرتی ہیں۔ ایک اللہ تعالیٰ کا قربِ خاص اور دوسرا رضائے الٰہی یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے اس بندے سے خوش ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی خوشی سب سے بڑی چیز ہے۔ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ[1]

قربِ الٰہی کے حصول کا ذریعہ

اس مقصود کے حاصل ہونے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس ذریعے میں اعمال و مجاہدے ہیں۔ ان مجاہدات میں کم کھانا، کم بولنا، کم سونا، لوگوں سے کم ملنا وغیرہ ہے اور اعمال میں اوصافِ حمیدہ مثلاً: نیت، اخلاص، انس، تبلیغ، تفکر، تفویض، تقوی، تواضع، توبہ، توحید، توکل، خشوع، خوف، دعاء، رجاء، رضا، زہد، شکر، شوق، صبر، صدق، اور محبت وغیرہ سے آراستہ ہونا اور اوصافِ رذیلہ یعنی آفاتِ لسان، (کذب وغیبت وغیرہ) اسراف، بخل، بغض، تکبر، حبِّ جاہ، حبِّ دنیا، حرص، حسد، ریا، شہوت، عجب، اور غضب وغیرہ سے اپنے آپ کو پاک کرنا۔ جب آدمی اس مقصود کو حاصل کرنے کے لیے کوئی ذریعہ اختیار کرتا ہے تو اس کے پیچھے کچھ چیزیں لگ کر آجاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے آپ یہاں سے گھر جائیں گے۔ آپ کا اصل مقصود گھر جانا ہے لیکن جب آپ جانے لگیں گے تو کبھی آپ کے دائیں طرف، کبھی بائیں طرف اسٹریٹ آئے گی، کبھی آپ کے سامنے ریڈ لائٹ آئے گی، کبھی پارک بھی آئے گا، جب طے شدہ

---

[1]: التوبۃ:۷۲۔

ہے کہ آپ گھر جائیں گے تو آپ کے سامنے یہ تمام چیزیں آئیں گی۔ اسی طرح جب آدمی اللہ تعالیٰ کا قربِ خاص حاصل کرنے کے لیے مجاہدہ اختیار کرتا ہے تو توابع کے طور پر کبھی کرامت، کبھی کشف، کبھی وجد، کبھی سرور، کبھی قبض، کبھی بسط وغیرہ، اس طرح کی کیفیات آدمی کو پیش آتی ہیں۔ کبھی کچھ انوار کا محسوس ہونا، کبھی ذکر میں مزہ آنا اور کبھی مزہ نہ آنا، کبھی رونا بہت آنا، یہ ساری چیزیں توابع کے طور پر آدمی کے ساتھ لگ جاتی ہیں۔ ان چیزوں میں سے کوئی بھی بزرگی کے لئے ضروری نہیں ہے۔ لوگ بزرگی اس کو سمجھتے ہیں کہ کوئی کرامت دکھادے، کسی کو کشف ہو جائے، جو دُعا کی ہے وہ قبول ہو جائے، الہام ہو جائے، بزرگی کے لیے ان تمام چیزوں کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ جو ایسا کر دے وہ بزرگ نہیں ہوتا، جو بزرگ ہے وہ ایسا ہی کرے یہ ضروری نہیں ہے۔ عام طور پر لوگ اسی چیز کو بزرگی کا معیار سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے بزرگوں سے تعلق کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ تمام چیزیں توابعات میں سے ہیں۔

بزرگی کی حقیقت

یہ ایک راستہ ہے۔ جب آدمی مجاہدہ کرتا ہے اور اس مجاہدے کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کے حکموں پر آئے گا، اور ان مجاہدوں سے لے کر اللہ تعالیٰ کے حکموں پر جمنے تک درمیان میں کچھ اثرات نمایاں ہوتے ہیں، کبھی کوئی چمکدار چیز نظر آجاتی ہے، کبھی کوئی آواز سنائی دیتی ہے، کبھی الہام ہو جاتا ہے، کبھی سچے خواب دکھائی دیتے ہیں، آدمی سمجھتا ہے کہ میں بزرگ ہو رہا ہوں حالانکہ ان چیزوں سے بزرگ نہیں ہوتا۔ بزرگی صرف اور صرف حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے طریقے سے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے میں ہے۔

شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے کا واقعہ ہے۔ اُن کے زمانے میں بزرگی کا دور دورہ تھا۔ حضرت کے ایک خادم اُڑ کر اُن کے پاس آئے (اس زمانے میں لوگ ایسی مشق

کرتے تھے کہ ہوا میں اُڑنا ایک عام بات ہو گئی تھی) اور حضرت کے برابر میں نماز پڑھنے لگے۔ جب خادم سجدے میں گئے تو ہاتھوں کی انگلیوں کے درمیان فاصلہ دے کر ہاتھ زمین پر رکھا۔ بعد میں لوگوں نے کہا کہ حضرت! یہ صاحب تو بڑے بزرگ ہیں کہ یہ اُڑ کر آپ کے پاس آکر نماز پڑھ رہے ہیں۔ اس پر حضرت بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ یہ کیسی بزرگی ہے، کہ اسے حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے طریقے پر سجدے میں ہاتھ رکھنا ہی نہیں آتا۔ اس واقعہ سے یہ بتادیا کہ نفس پر ریاضت کر کے اُڑنا یہ کوئی کرامت نہیں ہے اصل کرامت اور بزرگی اللہ تعالیٰ کا قرب اور وصال ہے جو اتباعِ سنت سے حاصل ہوتا ہے۔

اس کی ترتیب یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کا تعلقِ خاص حاصل کرنا سیکھے اور یہ تعلقِ خاص مجاہدات سے حاصل ہوتا ہے۔ اب یہ مجاہدات آدمی کو دو چیزوں سے آسانی سے حاصل ہوسکتے ہیں۔ ایک اللہ والوں کی صحبت سے، عام طور پر اللہ والوں کی صحبت کے بغیر آدمی کو مجاہدات حاصل نہیں ہوتے۔ دوسرے خود مجاہدہ کرنے سے۔

مولانا الیاس صاحبؒ بھی قطب الارشاد میں سے ہیں

جب حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت ملی تو انہوں نے لوگوں کو مرید کرنا شروع کر دیا۔ وہ بہت باکمال آدمی تھے، اس لیے کہ بہت مجاہدہ اختیار کرنے والے تھے۔ میں نے اُن کے ملفوظات میں یہ بات دیکھی کہ وہ فرماتے ہیں کہ جب میں کسی کو مرید کرتا ہوں اور اُس کو ذکر وغیرہ بتاتا ہوں تو اُس پر فوراً اثرات شروع ہو جاتے ہیں۔ ذکر، شغل، مراقبہ یہ سب بزرگی نہیں ہے۔ یہ سب ذرائع میں سے ہیں۔ کثرتِ ذکر، کثرتِ شغل و مراقبہ، کثرتِ نماز، روزوں کی کثرت وغیرہ یہ سب ذرائع میں سے ہیں۔ اب کوئی آدمی بہت نمازیں پڑھ رہا ہے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ اللہ والا ہے۔ نماز پڑھنا ذرائع میں سے ایک ذریعہ

ہے کہ اس ذریعہ کو اختیار کر کے آدمی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر لے۔ جو ضروری چیزیں ہیں جیسے فرض نمازیں، واجبات، سنتیں و مستحبات وغیرہ آدمی کو یہ سب کرنا ہی کرنا ہے۔ جب آدمی غیر ضروری چیزوں کو کر رہا ہے تو ضروری کو کیسے چھوڑ دے گا۔

مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے لوگوں کو مرید کرنا شروع کیا تو اُن لوگوں میں بہت تیزی سے اثرات شروع ہو گئے مگر میرے دل میں ایک بات آئی کہ کتنے لوگ میرے پاس آ رہے ہیں؟ اور کتنے لوگوں کو میں صحیح راستہ بتا رہا ہوں؟ بستیوں کی بستیاں اپنے غیر مسلم ہونے کا اعلان کر رہی تھیں۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب ہندوستان اور پاکستان ایک ہی تھے۔ تبلیغی تحریک ہندوستان کی تقسیم سے پہلے شروع ہوئی۔ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اُمت کا غم دے دیا کیونکہ آپ کو "قطب الارشاد" بنانا تھا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ جب آدمی کو ولایتِ خاصہ ملتی ہے تو اُس کو اہلِ تشریع یا اہلِ تکوین میں لے لیا جاتا ہے تاکہ اس سے لوگوں کی رُشد و ہدایت کا کام لیا جائے۔ کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ اُن کو "قطب" بنانا چاہتے تھے اس لیے اُن کو پوری اُمت کا درد دے دیا۔ اب وہ اُمت کے لیے روتے، اور خدا تعالیٰ سے دعائیں مانگتے کہ اے اللہ! کوئی تدبیر پیدا فرما دیجیے۔ مولانا الیاس صاحبؒ، اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح روتے اور بلبلاتے تھے کہ جیسے کسی عورت کا ایک چھوٹا بیٹا مر جائے تو وہ روتی ہے۔ اُن کے دل میں اُمت کا اتنا درد اُٹھنے لگا اور راتوں کی نیند اُڑ گئی، کروٹیں بدل بدل کر اپنا وقت گزارتے تھے۔ بیوی نے پوچھا کہ آپ اتنے بے چین ہیں، آخر آپ کے ساتھ کیا قصہ ہے؟ انہوں نے کہا کہ مت پوچھو کہ میرے ساتھ کیا قصہ ہے، اگر میں تم کو بتا دوں تو پھر بے چین ہونے والا ایک نہیں رہے گا بلکہ دو ہو جائیں گے۔

جو لوگ اُن کے پاس آتے تھے وہ دیکھتے تھے کہ لوگ چار چار، چھ چھ پیسوں کے لیے کیسی کیسی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ پھر اُن کے دل میں یہ بات آئی کہ کچھ کام کرنا چاہیے۔ پھر حق تعالیٰ شانہ، نے کام کی نوعیت سجھائی شروع کی۔ اصل چیز قرآن و حدیث ہوتی ہے۔ قطب الارشاد کو یہ چیز سجھائی جاتی ہے کہ لوگوں کو کس طرح قرآن وحدیث پر لایا جائے۔

تبلیغی تحریک کی ابتداء

مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود فرماتے ہیں کہ ابتداء میں جن لوگوں پر محنت شروع کی، اُن سے پوچھا کہ تم لوگ کس لیے آئے ہو؟ وہ بتاتے کہ ہم مزدوری کرنے آئے ہیں (کیونکہ وہ لوگ دوسرے علاقے میں مزدوری کرتے تھے) پھر اُن سے پوچھا کہ تم کو کیا ملتا ہے؟ مزدوروں نے کہا کہ ہم کو چھ پیسے ملتے ہیں۔ پھر مولانا فرماتے کہ میں تم کو چھ پیسے دے دوں گا، جو کام بھی میں لگانا چاہوں گا لگاؤں گا۔ مزدور کہتے کہ ٹھیک ہے۔ مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مزدور کو چھ پیسے دیئے کیونکہ اُس زمانے کے چھ پیسے بہت ہوتے تھے اور اسے مسجد میں بٹھا کر کلمہ، نماز وغیرہ سکھانے لگے۔ جب دوسرے مزدوروں کو پتہ چلا کہ مسجد میں بیٹھے بٹھائے اتنے پیسے ملتے ہیں اور نہ کچھ کھودنا پڑتا ہے اور نہ سامان اُٹھانا پڑتا ہے تو لوگ آہستہ آہستہ مسجد سے رجوع ہونے لگے۔ اس طرح لوگوں کی تعداد دن بہ دن بڑھتی ہی گئی۔

حقیقی محبت کی ایک مثال

مولانا الیاس صاحبؒ رئیس زادے اور بہت مالدار تھے۔ اپنی زمینیں بیچنا شروع کیں اور لوگوں کو دیتے رہے۔ جب اللہ تعالیٰ سے خاص قسم کی محبت ہو جاتی ہے تو آدمی کے بہت سے کام لوگوں کی مصلحت کے خلاف ہونے لگتے ہیں۔

یہاں پر ایک بات عرض کردوں کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو منافقین نے بے وقوف کہا۔ ہم نے بھی نہیں سوچا کہ انہوں نے ایسا کیوں کہا؟

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ[1]

کیا وجہ تھی کہ منافقین انہیں بے وقوف کہتے تھے؟ جب آدمی اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ محبت کرنے لگتا ہے تو اُس کے کاموں کا رجحان اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جاتا ہے۔ اُس کے بہت سے کام لوگوں کو دنیاوی مصلحت کے خلاف نظر آتے ہیں اور لوگ اُس کے کاموں پر کہتے ہیں کہ یہ تو کوئی طریقہ نہیں ہے، یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی، یہ بے وقوف ہے اس دنیا میں ایسی بات کر رہا ہے۔

اب مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو کچھ کر رہے تھے کہ زمینیں بیچ بیچ کر لوگوں کو مسجد میں بٹھا رہے تھے، لوگ کہہ رہے تھے کہ یہ بے وقوفی ہے۔ حالانکہ مولانا کو معلوم ہے کہ بے وقوفی کیا ہے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ[2]

جو بولنے والے ہیں وہ خود بے وقوف ہیں اُن کو کیا معلوم۔

جو کچھ یہ کر رہے ہیں یہ سب اُسی کے لیے کر رہے ہیں جس کے قبضہ و قدرت میں سب کچھ ہے۔ جب وہ مالک الملک کسی کو مل جائے گا تو اُس کے پاس کیا کمی رہ جائے گی۔

اگر مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی جائیدادوں کو رکھتے اور اُس کی آمدنی سے لوگوں کو کھلاتے تو وہ ایک سال بھی ایسا نہیں کھلا سکتے تھے جو اَب ستر سال سے کھلا رہے ہیں۔ مرکز نظام الدین میں لنگر کھلا ہوا ہے جب عرب آتے ہیں تو اُن کے حساب سے پکتا ہے،

---

[1]: البقرۃ:۱۳۔ [2]: البقرۃ:۱۳۔

جب امریکن آتے ہیں تو اُن کے حساب سے پکتا ہے، جب انڈیا اور پاکستان سے مختلف لوگ آتے ہیں تو اُن کے حساب سے پکتا ہے۔ ہر قسم کے آدمی کے حساب سے کھانا پکتا ہے اور روزانہ پکتا ہے اور بے حساب پکتا ہے۔ پہلے بزرگانِ دین کے پاس بھی ایسا ہی لنگر ہوا کرتا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق کی وجہ سے بزرگی حاصل ہو جاتی ہے تو اُن کو ایک فن آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے لینا اور مخلوق کو دینا۔ پھر مخلوق سے مانگنا باقی نہیں رہتا بلکہ مخلوق کو دینے کا ذہن ہوتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کے دینے کے راستے الگ الگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ خود مخلوق سے بھی اُنہیں دلواتے ہیں اور مخلوق کو اُن کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ ہی سے مانگتے ہیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ لوگوں سے دلواتے ہیں۔

"توکل" بہترین ذریعۂ معاش

تقسیم ہند سے پہلے ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس انگریز کا ایک بہت بڑا افسر پہنچا اور کہا کہ میں نے آپ کی بہت تعریف سنی ہے، آپ کا ذریعۂ معاش کیا ہے؟ مولانا نے کہا کہ کچھ بھی نہیں ہے۔ جب انگریز افسر جانے لگا تو اُس کے دل میں بات آئی کہ مولانا اتنا کام کر رہے ہیں، ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، چلو! ان کو کچھ دینا چاہیے۔ لہٰذا اُس نے اُس زمانے کے پچاس روپے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کیے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس کو یہاں سے لے جاؤ۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میرا ذریعۂ معاش توکل ہے۔ جس طرح دنیا کے حساب سے دکان ذریعہ ہوتی ہے، اسی طرح "توکل" بھی ایک مستقل ذریعۂ معاش ہے۔

غرض یہ ہے کہ ولایتِ خاصہ حاصل ہو جانے کے بعد جو باتیں سامنے آتی ہیں وہ باتیں میں عرض کر رہا ہوں۔

تبلیغی جماعت کے دو بنیادی کام

پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ سمجھایا کہ لوگوں میں طلب نہیں رہی اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا تعلق ملے تو کیسے ملے؟ ایمان اور تقویٰ کے تعلق کو بڑھانے کے لیے سیرت پاک پر غور کرنے سے اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل میں ان دونوں چیزوں کا متبادل سجھایا کہ ان کو اہل اللہ کی صحبت دی جائے اور مجاہدے پر ڈالا جائے۔

جماعت میں نکلنے والے پندرہ یا بیس افراد میں شاید کوئی ولی اللہ ہو، ان تمام افراد کے اس طرح جماعت میں نکلنے اور ایک ہی فکر پیدا ہو جانے سے ایک قسم کا ایمانی ماحول -جو اللہ والوں کی صحبت میں ہوتا ہے- بن جاتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ کیسے ہوتا ہے؟

صحبتِ اہل اللہ سے نورانی ماحول قائم ہونے کی مثال

جب مختلف دل نیک نیتی کے ساتھ جڑتے ہیں تو اُن کی کیفیات کے خاص اثرات ہوتے ہیں۔ آپ اس کو اس مثال سے سمجھئے کہ ایک کمرے میں پانچ موم بتیاں جلا دیجیے۔ دیکھنے میں تو وہ پانچ موم بتیاں ہیں لیکن اُن سے نکلنے والی روشنی سب ایک ہی ہے۔ آپ اس کی روشنی میں حد بندی نہیں کر سکتے کہ پہلی موم بتی کی روشنی یہاں سے یہاں تک ہے جبکہ دوسری موم بتی کی روشنی یہاں سے وہاں تک ہے۔ ایسے ہی قلب کو قلب سے راہ ہے۔ جب دلوں کے تعلق مع اللہ کو ایک جگہ جمع کیا جاتا ہے تو اُس سے نورانیت آتی ہے۔

مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سوچا کہ اگر کسی کو اہل اللہ کی صحبت پوری نہیں مل سکتی تو کیا یہ کم ہے کہ مسجدوں اور فرشتوں کے ماحول میں لوگوں کو نیک نیتی کے ساتھ جوڑا جائے کہ تم تمام غلبوں سے فارغ ہو کر محض اللہ کو راضی کرنے کے لیے دین سیکھنے مسجد کے ماحول میں آؤ۔ اصل تو اہل اللہ کی صحبت ہی ہے، اُس کے بغیر آدمی ولیِ کامل نہیں ہوتا۔ یہ

مرکزی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ولایت بغیر اللہ والوں کی صحبت کے نہیں دی جاتی۔ کیوں نہیں دی جاتی؟ مخلوق کو نہیں معلوم، یہ تو اللہ ہی سے پوچھا جاسکتا ہے، لیکن اب تک کا تجربہ یہی ہے۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جو کچھ بھی ملا وہ حضور ﷺ کی صحبت ہی سے ملا۔ "صحابہ" نام بھی اسی لیے پڑ گیا تاکہ بعد والوں کو پتہ چلے کہ صحبت اصل ہے ورنہ "صحابہ" کو مفسر، محدث، فقیہ کہا جاسکتا تھا۔ "صحابی" کا مطلب ساتھ رہنے والا حضور ﷺ کے ساتھ رہنے کی یہ برکت ہے۔ اصل چیز آدمی کو کسی نیک ماحول کا ملنا ہے۔ ولیٔ کامل کے پاس نیک ماحول ہوتا ہے۔ جب آدمی کو طلب ہوگی تو وہ ولیٔ کامل کے پاس جائے گا۔

اہل اللہ کی صحبت کا بدل

لوگوں کے پاس پہنچو اور اُنہیں اُن کے گندے ماحول سے نکال کر فرشتوں کے پاکیزہ ماحول میں لاؤ، پاکیزہ بات کرو، پاکیزہ عمل کرو۔ ایک کام مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سیرت پر غور کرکے یہ کیا کہ اللہ والوں کی صحبت کا بدل کسی بھی درجے میں فراہم کیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انہوں نے یہ کام اپنی طرف سے کیا مگر اُس وقت تک اس چیز کا رواج نہیں تھا۔ جب مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "دعوت" کے نام سے کام شروع کیا، اور وہ خود قرآن وحدیث کے ماہر تھے، انہوں نے بڑے علماء سے استفسار کیا کہ میں نے جو کچھ کام شروع کیا ہے وہ قرآن وحدیث کے خلاف تو نہیں ہے، باقاعدہ فتاویٰ لیے۔ علماء نے کہا کہ یہ کام خلافِ شرع نہیں ہے بلکہ بالکل صحیح ہے۔ پھر مولانا نے اس کام کو آگے بڑھایا۔

مجاہدہ کے اقسام

اور پھر مجاہدے کی ترتیب شروع کی۔ مجاہدہ بھی دو قسم کا ہوتا ہے ایک حقیقی اور ایک حکمی۔ مجاہدہ حقیقی یہ ہے کہ ہر حکم پر آدمی کا جمنا۔ راہ چل رہے ہیں، سامنے سے ایک عورت

آگئی، اب نظر کو نیچے رکھنا، یہ مجاہدۂ حقیقی ہے۔ مگر مجاہدۂ حقیقی مجاہدۂ حکمی کے بغیر نہیں ہوتا۔ اس سے پہلے آدمی کو مجاہدۂ حکمی یعنی نفس کو مخالفت کی عادت ڈالنی پڑتی ہے۔ جب تک ترک کرنے کی عادت نہیں ہوگی، نفس اپنی لذت کو چھوڑ نہیں سکے گا۔

کوئی کسی عورت کو کیوں دیکھتا ہے؟ بس ایک حرام مزہ ملتا ہے۔ وقتی مزہ ہے اور وہ بھی حرام ہے اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔

اب نہ دور شباب باقی ہے
اور نہ دورِ شراب باقی ہے
لذتیں سب ختم ہوگئیں امجد
لذتوں کا عذاب باقی ہے

بتایئے! کیا باقی رہ گیا۔ وہ وقتی طور پر آدمی کا تأثر ہوتا ہے جس میں آدمی مشغول ہوتا ہے۔ نفس کو لذت دینے کی جو عادت ہے یعنی کھانے کی لذت، بولنے کی لذت، چھونے کی لذت، دیکھنے کی لذت وغیرہ، لذت حاصل کرنا یہ نفس کی خصوصیت ہے۔ اسی طرح شہوت ہے۔ آدمی کو ان چیزوں کو ترک کرنے کی عادت دوسرے ذریعے سے پہلے ڈالنی پڑتی ہے۔ اس کا نام "مجاہدۂ حکمی" ہے، اس کے بغیر نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم یہ کام کرو۔ مگر تجربہ یہی ہے کہ آدمی یہ سارے کام اُسی وقت کرنے پر قادر ہوگا جو اس نے پہلے سے سیکھا ہوا ہو۔

کوئی آدمی ڈاکٹری کر رہا ہے، کوئی انجینئرنگ کر رہا ہے۔ اب ڈاکٹر صاحب نسخہ لکھ رہے ہیں اور ان کو نسخہ لکھنا بھی ضروری ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نسخہ اس وقت تک نہیں لکھ سکتے جب تک کہ انہوں نے پہلے سے سیکھا ہوا نہ ہو۔

یہی حال مجاہدۂ حکمی میں ہے۔ مجاہدۂ حکمی اصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے فرائض تک جانے کا یہ ایک راستہ ہوتا ہے۔ دعوت میں یہی مجاہدہ ہے کہ بستر سر پر اُٹھالو، مسجد میں رہو، خود پکاؤ، خود کھاؤ، زمین پر سو جاؤ، امیروں اور غریبوں کے ساتھ رہو، اپنے آپ کو چھوٹا بنا کر رکھو، یہ تمام چیزیں ایسی نہیں ہیں کہ ان کا براہِ راست حکم حدیث میں مل جائے کہ بستر سر پر رکھ کر جاؤ۔ مگر اس طرح کا ماحول بننے سے آدمی کا نفس مرتا ہے اور اس کو اپنی طبیعت کے خلاف کرنے کی عادت پڑتی ہے۔ پھر جب اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا تعلق اور خوف ملتا ہے اور آدمی کو اپنی طبیعت کے خلاف اللہ تعالیٰ کا حکم پورا کرنے کی نوبت آتی ہے تو آدمی بآسانی کرلیتا ہے۔

پہلے لوگ اپنے نفس کے خلاف طبیعت کو عادی بنانے کے لیے مجاہدے کیا کرتے تھے۔ میں قصہ سناتا ہوں کہ مجاہدۂ حقیقی سے پہلے مجاہدۂ حکمی کس طرح ہوتا ہے۔ یہ ایک چلنے کا راستہ ہے۔ خدا کرے! اگر امریکا کے ماحول میں کچھ لوگوں کو اس کا چسکا لگ گیا اور کچھ لوگوں کو ولایت مل گئی اور اس راستے پر چلے گئے تو دوستو! یہ بہت بڑی بات ہوگی کیونکہ یہاں کے ماحول میں آدمی کے لیے ولایتِ خاصہ بہت مشکل ہے۔ ولایتِ خاصہ کا مدار شریعت پر چلنے سے ہے۔

حضور ﷺ کی ایک نظر بھی ولایتِ خاصّہ کے لئے کافی ہے

حضور ﷺ کے زمانے میں حضور ﷺ کی برکت سے جو آدمی ایمان میں داخل ہوتا تھا وہ ولیٔ خاص بن جاتا تھا اور اُسے ایمانِ کامل مل جاتا تھا۔ اسی وجہ سے اُس وقت جو بھی ایمان میں داخل ہوجاتا تھا اُس کے لیے ہر قسم کی قربانیاں آسان تھیں۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ہماری زندگی میں ایک فرق ہے، جسے عام طور پر لوگ بیان نہیں کرتے یا سمجھتے نہیں ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ صحابہ مجاہدات اختیار کر کے ایمان کو کامل کئے بلکہ اُن کے ایمان کا کمال اُن سے ویسے مجاہدات کرواتا تھا۔ مگر اُنہیں مجاہدات کے ذریعے سے ترقی ضرور ہوتی تھی لیکن اگر آدمی کے ایمان میں کمال نہیں ہے تو پھر وہ قربانی نہیں دے سکتا۔

ایک صحابی قبل از اسلام محبوبہ کے ساتھ گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ محبوبہ گا اور ناچ رہی ہے۔ ان کو مستی آ گئی۔ محبوبہ نے کہا کہ جب تک شراب اور کباب نہ ہو تو ملنے کا کیا مزہ ہے؟۔ انہوں نے کہا کہ میں ابھی اونٹ کا جگر لے کر آتا ہوں، اُس کا کباب بنائیں۔ بازار میں جا رہے تھے کہ راستے میں حضور ﷺ مل گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ کب تک غفلت میں پڑا رہے گا؟ حضور ﷺ کی نظر مبارک پڑتے ہی اُن کی کایا پلٹ گئی اور فوراً لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ پڑھ لیا۔ اب جب شراب اور کباب کو چھوڑ کر گھر واپس ہوئے تو محبوبہ دروازے پر کھڑی ہے کہ کب شراب اور کباب لے کر لوٹیں گے۔ وہ دروازے کے سامنے سے گزرے تو محبوبہ سوچنے لگی کہ یہ پاگل تو نہیں ہے، میں یہاں کھڑی ہوں اور یہ آگے جا رہا ہے۔ محبوبہ نے آواز دے کر پوچھا کہ تم آگے جا رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہاں اب مجھے آگے ہی جانا ہے، میرا تجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

صحابہ کے ایمان میں یہ خصوصیت تھی کہ حضور ﷺ کی نظر و صحبت کی برکت سے ایمان میں کمال آ جاتا تھا۔ اُس کمال کے ذریعے سے صحابہ بڑی سے بڑی قربانیاں دیتے تھے۔ ان قربانیوں کے ذریعے سے اُن کو اور ترقی ہوتی تھی۔ بعد میں جیسے جیسے حضور ﷺ کے زمانے سے دُوری ہوتی چلی گئی تو ولایت میں فرق آنے لگا۔ اب ایمان میں آنے کے باجود لوگوں میں ضعف اور کمزوری ہوتی چلی گئی۔ بزرگوں نے اس کمزوری کا علاج اپنے اجتہادات، کوششوں اور مختلف طریقوں سے کرنا شروع کیا۔ پہلے اتنی ہمت آ جاتی تھی کہ آدمی واقعتاً بڑی سے بڑی

چیز کی قربانی بآسانی دے سکتا تھا۔ جب بعد میں اللہ تعالیٰ کے حکموں پر جمنے کے لیے قربانی دینا آسان نہیں رہا تو کوشش کر کے پہلے یہ صلاحیت پیدا کی جانے لگی کہ جس کے بعد نفس کی مخالفت کی ہمت ہو سکے، پھر اس کے بعد مخالفت آسان ہوئی۔

حضرت شاہ عبد القدوس گنگوہیؒ کے پوتے کا واقعہ

حضرت شاہ ابو سعید، عبد القدوس گنگوہیؒ کے پوتے ہیں۔ حضرت شاہ عبد القدوس گنگوہیؒ کے ایک خلیفہ شاہ نظام الدین بلخیؒ تھے۔ وہ بلخ سے آئے تھے۔ حضرت شاہ عبد القدوس گنگوہیؒ نے نظام الدین بلخی کا تزکیۂ باطن اور اصلاح کی۔ اس کے بعد حضرت نے اُن کو اصلاح کی اجازت دی۔ وہ اپنے وطن واپس چلے گئے۔ جو حال نواب زادوں کا ہوتا ہے وہی حال پیر زادوں کا ہوتا ہے۔ شاہ ابو سعیدؒ کی زندگی بھی اسی حال میں گزرتی رہی۔ ایک مرتبہ اُن کے دل میں بات آئی کہ میرے دادا کتنے بڑے اللہ والے تھے اور میرے والد بھی کتنے بڑے اللہ والے تھے، مجھے اپنی زندگی صحیح کرنی چاہیے۔ انہوں نے دیکھا کہ میں یہاں رہ کر یہ چیز حاصل نہیں کر سکوں گا، مجھے کچھ کرنا چاہیے۔ اُن کے ذہن میں یہ بات آئی کہ میں اپنی تربیت کے لیے دادا کے خلیفہ کے پاس بلخ چلا جاؤں۔ شاہ ابو سعید نے یہاں سے لکھا کہ میں آپ کے پاس آرہا ہوں۔ حضرت شاہ نظام الدین بلخیؒ نے شیخ کی نسبت کی وجہ سے پوتے کا بستی سے باہر آکر استقبال کیا اور اپنا عمامہ بچھایا کہ آپ اس پر چل کر آئیں، آپ ہمارے شہزادے ہیں۔ اُن کو اپنی خانقاہ لے آئے۔ وہاں اُن کی خوب خاطر تواضع کی۔ پہلے کے بزرگوں کو تین دن کے بعد پوچھنے کی عادت تھی۔ تین دن بعد پوچھا کہ صاحبزادے! کیسے زحمت فرمائی؟ شاہ ابو سعیدؒ نے کہا آپ میرے دادا کے پاس سے جو امانت لے کر آئے ہیں، میں وہ لینے آیا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اگر دادا والی امانت لینی ہے تو پھر یہ نوابیت نہیں چلے گی۔ شاہ ابو سعید نے کہا کہ آپ جو

فرمائیں گے میں وہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ حضرت نظام الدین بلخی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے پھر ہمارا رویہ بدل جائے گا تو بُرا نہیں ماننا کیونکہ ہمیں آپ کی تربیت کرنی ہے۔

سب سے پہلے دو کام ذمے لگائے۔ ایک تو یہ کہا کہ تم ہماری مجلس میں بیٹھنے کے قابل نہیں ہو، تمہارے اندر اتنی استعداد نہیں ہے کہ تم ہماری بات کو سمجھ سکو۔ (یہ بھی ایک استعداد کی بات ہوتی ہے کہ کب آدمی دین کی بات لینے کے قابل ہوتا ہے) دوسری بات یہ ہے کہ جتنے مریدین میرے پاس آئے ہوئے ہیں اُن سب کا بیت الخلاء صاف کرنا آپ کے لیے ضروری ہے۔ انہوں نے کہا کہ منظور ہے۔ اب روزانہ بیت الخلاء صاف کرتے اور مجلس میں نہیں بیٹھتے تھے۔ جب کچھ دن گزر گئے تو شاہ نظام الدین بلخیؒ نے فرمایا کہ تم ہماری مجلس میں بیٹھ سکتے ہو، مگر کچھ بول نہیں سکتے۔

اور خاموش رہنا معمولی نہیں بات ہے۔ بولنے سے بحث ہوتی ہے۔ بحث آدمی کو صحیح بات قبول کرنے نہیں دیتی۔ ہمیشہ کے لیے یہ قاعدہ یاد رکھ لیجیے کہ اگر واقعتاً قرآن و حدیث کا علم چاہیے تو کسی صاحبِ علم کے سامنے خاموش بیٹھ کر سنیں۔ وہ جو سوال کرے تو یہی کہے کہ مجھے نہیں آتا۔ یہ قاعدہ ہے۔ سوال و جواب یعنی تعلیم و تعلّم کرنے کا مقام اسکول اور مدرسہ ہے۔ اگر کوئی مدرسے میں عالم بننے کے لیے داخل ہوگیا تو وہاں پر سوال نہ کرنے سے کچھ نہیں آئے گا بلکہ سوال کرنے ہی سے کچھ آئے گا۔ لیکن عام سطح پر سوال نہ کرنے سے آتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی ایک عادت ہے۔

حضرت نے اُن سے کہا کہ آپ کو میری مجلس میں آنے کی اجازت ہے لیکن کچھ کہنے کی اجازت نہیں ہے اور کہا کہ تمہارے کام میں ترقی کی جاتی ہے، اب تم بیت الخلاء صاف کرنے

کے بجائے تہجد میں اُٹھنے والے ہمارے مریدین کے لیے ایندھن جلا کر پانی گرم کر دیا کرو۔ شاہ ابو سعید نے کہا کہ ٹھیک ہے۔

اب آپ اندازہ لگایئے کہ تہجد میں اُٹھنے والے مریدین کو گرم پانی مہیا کرنا کتنا مجاہدے والا کام ہے۔ اگر مریدین تین بجے اُٹھتے ہیں تو انہیں پانی دو بجے اُٹھ کر گرم کرنا پڑتا ہے۔ اس پر بھی کچھ وقت گزر گیا۔ اب کوئی آدمی سوچے کہ اس طرح پانی گرم کرنا سنت ہے، واجب ہے یا مستحب ہے۔ پہلے زمانے کے لوگ ایسا نہیں سوچتے تھے بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ نفس کو مارنے کی تدبیریں ہیں۔ اس کے بعد حضرت نظام الدین بلخی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیکھنا چاہا کہ ان کے ذہن میں کتنا کبر ہے؟ نجاست صاف کرنے کے لیے ایک بوڑھی عورت آیا کرتی تھی، حضرت نے اُس سے کہا کہ ٹھوکر یا کسی اور بہانے غلاظت کا ٹوکرا شاہ ابو سعید کے اوپر ڈال دینا۔ چنانچہ شاہ ابو سعید جا رہے تھے، برابر سے یہ بوڑھی عورت گزری اور کسی بہانے سے غلاظت کا ٹوکرا ان کے اوپر ڈال دیا۔ ان کے جسم پر اوپر سے نیچے تک غلاظت ہی غلاظت لگ گئی۔ اب شاہ ابو سعید کو بہت غصہ آیا، صرف گھور کر دیکھا اور کہا کہ یہ گنگوہ نہیں ہے، اگر گنگوہ ہوتا تو پھر میں تیری خبر لیتا۔

شیخ کو بوڑھی عورت نے آکر اطلاع دی کہ میں نے ٹوکرا اُن کے اوپر ڈال دیا۔ شیخ نے پوچھا کہ پھر کیا ہوا؟ اُس نے کہا کہ انہوں نے کچھ زیادہ نہیں کہا، بس گھور کر دیکھا اور کہا کہ گنگوہ نہیں ہے، اگر گنگوہ ہوتا تو پھر میں تیری خبر لیتا۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ ابھی دماغ سے خناس نہیں نکلا۔

پھر شاہ ابو سعید نے دوبارہ وہی کام کرنا شروع کیا۔ حضرت نظام الدین بلخیؒ کے پاس شکاری کتّے تھے۔ شاہ ابو سعید کی ذمہ داری میں شکاری کتّوں کا خیال رکھنے اور ٹہلانے کا اضافہ کر دیا۔

شکاری کتا رکھنا جائز ہے، قرآن شریف میں باضابطہ اس کی اجازت ہے۔ شکاری کتا اس حد تک جائز ہے کہ شکاری کتے کے شکار کو ذبح کرنا بھی ضروری نہیں ہوتا۔ قرآن شریف میں ہے:

جب کتے کسی کو پکڑ لیں تو وہ جانور تمہارے لیے حلال ہو جائے گا جبکہ تم بسم اللہ کہہ کر چھوڑ دو۔[1]

اگر آدمی بِسۡمِ اللّٰہِ کہہ کر کتّے کو چھوڑ دے تو کتّے کا پکڑنا ذبح کے قائم مقام ہو جاتا ہے جبکہ وہ کتّا تربیت یافتہ ہو۔

غرض شاہ ابوسعید کی ذمہ داری میں شکاری کتوں کو ٹہلانے کی ذمہ داری کا اضافہ ہو گیا اور کام چلتا رہا۔ جب ایک مدت گزر گئی تو شیخ نے اُن کے چہرے پر تغیر دیکھا۔ ایک بار پھر بوڑھی عورت سے کہا کہ ایک مرتبہ اور ان کے اوپر کچرا ڈال دو۔ اس عورت نے شاہ ابوسعید کے اوپر کچرا ڈال دیا۔ وہ رونے لگے اور عورت سے معافی مانگنے لگے کہ مجھے معاف کر دینا، تم کچرا لے کر جارہی تھیں، میں سامنے آگیا، میری وجہ سے تیری ساری محنت رائیگاں ہو گئی۔ اور کہا کہ تو تو اپنا کام کر چکی تھی لہٰذا یہ کچرا میں اُٹھا کر ڈالتا ہوں۔ پھر شاہ ابوسعید خود کچرا سمیٹنے لگے۔ اس عورت نے شیخ کو اطلاع کی کہ جب اس مرتبہ میں نے اُن کے اوپر کچرا ڈالا تو اُن کو غصہ آنے کی بات تو دور ہے، وہ بچارے اتنے نرم ہو گئے کہ انہوں نے معافی چاہی اور رو رہے تھے، انہوں نے خود کچرا اُٹھا کر پھینک دیا۔ پھر شاہ نظام الدین بلخیؒ نے فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ شاہ ابوسعید جس کے کام کے لیے آئے تھے اُس کی زمین تیار ہو گئی۔ پھر اُن کو اپنی مجلس میں بٹھایا اور ذکر و شغل بتایا، علوم عطا کیے، تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ تب کہیں جا کر شاہ ابوسعید شیخ بن گئے۔ مشائخ کا سلسلہ انہی کے راستے سے ہوتا ہوا جاتا ہے۔

---

[1]: المائدۃ: ۴۔

مجاہدۂ حکمی پر مجاہدۂ حقیقی کا انحصار

پہلے زمانے میں نفس کو مٹانے کے لیے جو تدابیر اختیار کی جاتی تھیں اُن کا نام "مجاہدات حکمیہ" ہے یعنی شریعت میں اس کا براہِ راست حکم نہیں لیکن یہ سب کچھ کرنے سے کئی حکموں پر چلنے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بغیر یہ صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ جب تک آدمی مجاہدۂ حکمی اختیار نہیں کرتا تو مجاہدۂ حقیقی نہیں کر سکتا، جب تک مجاہدہ حقیقی اختیار نہیں کر سکتا تو اُس کا ظاہر و باطن سنور نہیں سکتا، جب ظاہر و باطن نہیں سنورتا تو تعلق مع اللہ کی استعداد پیدا نہیں ہوتی۔ جب یہ سارے مراحل طے ہو جاتے ہیں تب اللہ تعالیٰ اپنا فیضانِ خاص فرما کر آدمی کو اپنے قربِ خاص سے سرفراز فرماتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں ان سب چیزوں کے حل کے واسطے حق تعالیٰ شانہ، نے پورے عالَم میں مولانا الیاس صاحبؒ کو استعمال فرمایا، اصل اللہ تعالیٰ ہی کرتے ہیں لیکن اپنے بندوں پر مہربانی کر کے صورتیں نکالتے ہیں، انہوں نے ان دونوں چیزوں کو جمع کیا ایک مجاہدہ کو اور دوسرے نیک ماحول کو۔ اس میں آدمی جتنی ترقی کرے گا اتنا ہی اوپر جائے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ آدمی تبلیغ پر جا کر آ گیا تو اللہ والا بن جاتا ہے۔ تبلیغ پر تو گیا لیکن واپس آنے کے بعد اپنی قدر نہیں کی اور اپنے ایمان کی حفاظت نہیں کی تو کیا حاصل؟ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا، ابھی لوگ صرف نماز پڑھ رہے ہیں، ابھی لوگ حلال و حرام کی معمولی سی تمیز کر رہے ہیں، ابھی کہاں حسد دلوں سے نکل رہا ہے، ابھی کہاں ریا تمام چیزوں سے نکل رہی ہے، ابھی تو اخلاص کی ہوا بھی نہیں لگی۔ ہم اپنے کو مخلص تو کہتے ہیں لیکن ہمیں اخلاص کی حقیقت ہی نہیں معلوم تو پھر مخلص کہاں سے بنتے۔ اس کے لیے ایک وقت درکار ہے۔ مگر اُمت کسی نہ کسی درجے میں اس راستے

پر پڑ رہی ہے۔ اب جس میں جتنی سکت ہو گی وہ اتنے کمال تک پہنچے گا۔ یہ ہوتی ہے "ولایتِ خاصہ"۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک ہوتی ہے ولایتِ عامہ جو حق تعالیٰ نے ہر ایمان والے کو دی ہے اور ایک ہوتی ہے ولایتِ خاصہ جس سے اللہ تعالی مجاہدے کے ذریعے اور اہل اللہ، کاملین کی صحبت کی برکت سے صفائی باطن کے بعد کسی کو محروم نہیں فرماتے۔ اس کے بارے میں فرمایا:

اللهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُمْ مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ۔

کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے ولی ہیں جو اُن کو ظلمتوں سے نکالتے ہیں اور نور کی طرف لاتے ہیں اور جو کافر ہیں اُن کے ولی طاغوت ہیں جو اُن کو نور سے نکال کر ظلمت کی طرف لاتے ہیں، وہ جہنمی ہیں وہ اُس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے ہم سب کو اپنی ولایتِ خاصہ سے سرفراز فرمائے۔ آمین